ISSN 2582-1229,E-ISSN 2582-9157

سابق یو جی سی کیئر لسٹڈ بین الاقوامی پیر ریویوڈ ریفریڈ جرنل

سہ ماہی — دہلی

تاریخ ادب اردو

معتبر، ہم مرتبہ جائزہ شدہ بین الشعبہ جاتی و کثیر لسانی تحقیقی جریدہ

غلام محمد قاصر کے خصوصی نمبر

جولائی تا ستمبر ۲۰۲۶ء

جلد: ۸ شمارہ: ۳



مدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

UGC Care Listed
International Peer Raviewed Refreed Journal

ISSN 2582-1229,E-ISSN 2582-9157
سابق یو جی سی کیئر لسٹڈ بین الاقوامی پیر ریویوڈ ریفریڈ جرنل

جلد:۸ شمارہ:۳

تاریخ ادب اردو

معتبر، ہم مرتبہ جائزہ شدہ بین الشعبہ جاتی و کثیر لسانی تحقیقی جریدہ

جولائی تا ستمبر ۲۰۲۶ء

سرپرست اعلیٰ	پروفیسر ارتضیٰ کریم	سرپرست اعلیٰ	پروفیسر راکیش کمار پانڈے
مدیر	پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا	نائب مدیر	محمد رمیض رضا مصباحی
تکنیکی و فنی معاون مدیر:	محمد شاہد رضا مصباحی	ایسوسی ایٹ ایڈیٹر	ڈاکٹر محمد بہلول

قانونی مشیر	ایڈوکیٹ انیل کمار سنگھ	قانونی مشیر	ایڈوکیٹ سیما سنگھ

زر تعاون

فی شمارہ:۱۰۰۰(ایک ہزار)روپے
خصوصی شمارہ:۳۰۰۰(تین ہزار)
سالانہ:۱۵۰۰۰(پندرہ ہزار)روپے
خصوصی تعاون:۲۵۰۰۰(پچیس ہزار)روپے

Bank Details

PEACE INDIA FOUNDATION

Account No. — 51521131001918 IFSC Code — PUNB515210

خط و کتابت / ترسیل وزر کا پتہ

سہ ماہی تاریخ ادب اردو، ۲۴۹۶/دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷
E-mail: editortau@gmail.com website: tareekheadabeurdu.com
Mobile No:+91-9968244001,6394368447

نوٹ

اس شمارہ کے مشمولات سے مدیر / وابستگان کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی تحریر / اقتباس کے لیے مضمون نگار خود ذمہ دار ہے۔ "تاریخ ادب اردو" سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

ادارتی بورڈ

پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر ڈاکٹر ندیم احمد
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر ڈاکٹر محمد کاظم
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر ڈاکٹر احمد امتیاز
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر ڈاکٹر محمد محسن
شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر ڈاکٹر رسال سنگھ
شعبۂ ہندی، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر کوثر مظہری
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر عمران عند لیب
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر مشتاق عالم قادری
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر سنجے کمار
مرکزی یونیورسٹی آف ہماچل

پروفیسر بلرام شکلا
شعبۂ سنسکرت، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر ڈاکٹر شاہد رزمی
شعبۂ اردو، منگیر یونیورسٹی، بہار

پروفیسر پرمود کمار بھارتی
شعبۂ سنسکرت، میونسپل پی جی کالج، مسوری، اتراکھنڈ

ماسٹر محمد رفیع
ریاستی کنوینر، قومی اساتذہ تنظیم، بہار

مولانا محمد شاہد عادل قاسمی
پرنسپل، مدرسہ یتیم خانہ، اراریہ

ڈاکٹر مجیب احمد خان
شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر ندیم احمد
شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر روپیش کمار چوہان
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ سنسکرت، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر عارف اشتیاق
شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر پشیندر کمار نم
شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

سمیہ زیب
پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ہزارہ مانسہرہ، پاکستان

مشمولات

نمبر شمار	مضامین	مقالہ نگار	صفحہ نمبر
1	اداریہ	ایڈیٹر	5
2	غلام محمد قاصر: احوال و آثار	عماد قاصر	9
3	سخن غلام محمد قاصر	شاعر علی شاعر	29
4	غلام محمد قاصر کی شاعری میں محبت کا کردار۔۔۔	سمیہ زیب	42
5	غلام محمد قاصر بطور ڈرامہ نگار	خانزادہ عباداللہ /سمیہ زیب	57
6	غلام محمد قاصر: ایک منفرد مرثیہ نگار	امامہ میر	74
7	غلام محمد قاصر کی شاعری میں جمالیاتی عناصر	سمیہ زیب	86
8	غلام محمد قاصر کی شاعری میں رجائی عناصر مجموعہ	لاریب ارشاد	99
9	غلام محمد قاصر کی شعری لفظیات	فضہ خالد	114

پروفیسر (صبا ڈاکٹر) محمد یحییٰ
شعبہ اردو کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی 110007

اداریہ

'تاریخِ ادبِ اردو' کا یہ خصوصی نمبر غلام محمد قاصر کے ادبی شہپاروں (نثر و نظم) پر مبنی تحقیق شدہ اور انتہائی معلوماتی مقالات کا ایک نفیس انتخاب پیش کرتا ہے، جنہیں عہدِ حاضر کے جلیل القدر ادبی اکابرین نے تحریر کیا ہے۔ یہ خاص شمارہ غلام محمد قاصر کی حیات اور ان کے اسلوبِ شاعری سے تعارف کرواتا ہے، جو ان کی تخلیقات کی تفہیم کے لیے ایک بصیرت افروز پس منظر فراہم کرتا ہے۔ اس میں سات ممتاز دانشوروں کے تحریر کردہ مقالے بھی شامل ہیں۔

غلام محمد قاصر حسن اور جمال کی ہر صورت کے شیدائی ہیں۔ اگرچہ وہ محبت کے نغمے گاتے ہیں، مگر ان کی شاعری میں ایک گہرا درد اور کسک سرائیت کیے ہوئے ہے؛ وہ محبوب کی موجودگی میں بھی اس کی فرقت اور قرب کی تشنہ کامی محسوس کرتے ہیں۔ تنہائی اور طویل رات کا سکوت ان کی متعدد غزلوں اور نظموں کے لیے ایک روپہلی اور خوابناک پس منظر تشکیل دیتا ہے۔ ان کا تصورِ محبت محض شخصی اور ذاتی تڑپ تک محدود نہیں، بلکہ وہ تنہائی کے بنیادی سرچشموں کی تلاش کرتے ہوئے اسے کائنات کے سکوت سے جوڑتے ہیں اور ان پر اسرار رموز پر غور و فکر کرتے ہیں جو اس نظامِ عالم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ غلام محمد قاصر کی یہ خواہش رہی کہ اردو شاعری ان تمام لوگوں کے لیے بھی سلیس اور قابلِ فہم بنائی جائے جو

اس زبان سے محبت تو رکھتے ہیں مگر اس کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔

محترم غلام محمد قاصر کے فرزندِ گرامی عماد قاصر نے اپنے مقالے احوال و آثار "(جو اس خصوصی نمبر میں شامل ہے) کے خلاصے میں تحریر کیا ہے:

"غلام محمد قاصر (سرکاری دستاویزات کے مطابق) ۱۹۴۱ء میں پہاڑ پور، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان (خیبر پختونخوا) میں پیدا ہوئے۔ ان کے ادبی سفر کو ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخر اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اس وقت زبردست تقویت ملی جب احمد ندیم قاسمی نے ان کی غزلوں کو 'فنون' میں شائع کرنا شروع کیا۔ اپنی زندگی میں ان کے تین شہرہ آفاق شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے: 'تسلسل' (۱۹۷۷ء)، 'آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے' (۱۹۸۸ء) اور 'دریائے گمان' (۱۹۹۷ء)۔ ان کا فن شایانِ شان پذیرائی کا حامل رہا؛ قاصر صاحب ۲۰ فروری ۱۹۹۹ء کو پشاور میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے ۲۰۰۷ء میں انہیں بعد از مرگ 'صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی' (پرائیڈ آف پرفارمنس) سے نوازا گیا۔ ان کی ادبی میراث 'کلیاتِ قاصر' (ایک شعر ابھی تک رہتا ہے)، 'سرِ شاخِ یقین' اور مختلف ادبی جرائد کے خصوصی شماروں کی صورت میں پوری آب و تاب سے محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں، ان کا کلام متعدد جامعات کے تعلیمی نصاب کا حصہ بھی بنایا جا چکا ہے۔"

ایڈیٹر تاریخ ادب اردو

Prof. (Dr.) Mohammad Yaahya Saba

Department of Urdu Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi110007

Editorial

This special number of Tareekh e Adab e Urdu on Ghulam Muhammad Qasir's literary works presents carefully curated informative research articles from his prose and poetry in Urdu, these research articles written by the present times literary giants. This special number of Tareekh e Adab e Urdu introduces Ghulam Muhammad Qasir's life and poetic style, providing valuable context to his works. It also includes an article by seven eminent intellectuals. Ghulam Muhammad Qasir is a lover of all things beautiful. Though he writes of love, a deep pain permeates his poetry, and he yearns for his beloved even in her presence. Loneliness and quietude of the vast night form a dreamy backdrop to several of his ghazals and nazms. His love transcends personal longing, exploring the origins of solitude and connecting it to the stillness of the cosmos, contemplating the mysteries that enshroud it. Ghulam Muhammad Qasir aspires to make Urdu poetry available to those who love Urdu but struggle with the nuances of the language.

Imad Kasir, son of Mr. Ghulam Muhammad Qasir has written in the abstract of his article title "life and

works" which is included in this special number Please note " Ghulam Muhammad Qasir was born 1941(As per official record) in Paharpur, Dera Ismail Khan, Khyber Pakhtunkhwa. His literary career gained significant momentum in the late 1960s and 1970s through the support of Ahmed Nadim Qasmi, who published Qasir's ghazals in Fanoon. Throughout his lifetime, Qasir published three celebrated poetry collections: Tasalsul (1977), Aathwan Aasman Bhi Neela Hai (1988), and Daryaye Guman (1997). His work earned prestigious recognitions, Qasir passed away on February 20, 1999, in Peshawar. Posthumously, he was awarded the Presidential Pride of Performance)

Presidential award for pride of performance) by the Government of Pakistan in 2007. His literary legacy continues to be preserved through complete compilations such as Kuliyat-e-Qasir (Ek Sher Abhi Tak Rehta Hai) and Sar-e-Shakh-e-Yaqeen, special literary journal editions. The included of his poetry in educational curricula across several universities."

Editor Tareekh e Adab e Urdu

عماد قاصر فرزند غلام محمد قاصر

ادبی دانشور/مصور

غلام محمد قاصر: احوال وآثار

Abstract:

Ghulam Muhammad Qasir was a distinguished Urdu poet and academic born in Paharpur, Dera Ismail Khan, Khyber Pakhtunkhwa. Though his official school records state his date of birth as September 4, 1941, research indicates he was actually born around 1943–1944. He grew up in humble circumstances after losing his father at the age of three, raised by a resilient mother . After completing his matriculation, Qasir initially worked as a school teacher in Paharpur, pursuing his higher education privately until earning his M.A. in Urdu, which eventually led to a teaching career as a college lecturer. His literary career gained significant momentum in the late 1960s and 1970s through the support of Ahmed Nadim Qasmi, who published Qasir's ghazals in Fanoon.

Throughout his lifetime, Qasir published three celebrated poetry collections: Tsalsul (1977), Aathwan Aasman Bhi Neela Hai (1988), and Daryaye Guman (1997). His work earned prestigious recognitions, Qasir passed away on February 20, 1999, in Peshawar. Posthumously, he was awarded the Presidential Pride of Performance (Tamgha-e-Imtiaz) by the Government of Paki-

stan in 2007. His literary legacy continues to be preserved through complete compilations such as Kuliyat-e-Qasir (Ek Sher Abhi Tak Rehta Hai) and Sar-e-Shakh-e-Yaqeen, special literary journal editions, and the inclusion of his poetry in educational curricula across several universities).

Key Words: (Ghulam Mohammad Qasir, poet, Dera Ismail Khan, Funoon, Pride of Performance, Kulyat e Qasir, Sar e Shakh e Yaqeen)

دریائے سندھ کے کنارے پر آباد ڈیرہ اسماعیل خان، صوبہ خیبر پختونخوا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اور پہاڑ پور اس شہر کی ایک تحصیل ہے۔ تعلیمی اور ادبی لحاظ سے ے یہ شہر کبھی پسماندہ نہیں رہا اس شہر نے ادب کو بہت اہم اور بڑے نام عطا کیے۔

اردو شاعری میں غلام محمد قاصر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کی پیدائش پاکستان کے قیام سے کچھ برس پیشتر پہاڑ پور میں ہوئی۔ ان کی تاریخ اور سنہ پیدائش، ان کی تعلیمی اسناد اور دفتری دستاویزات کے مطابق 4 ستمبر 1941ء ہے۔ تاہم یہ درست نہیں، انہوں نے خود متعدد مقامات پر ذکر کیا؛ چونکہ ان کے والدین تعلیم یافتہ نہیں تھے، لہٰذا جب انہیں سکول میں داخل کیا گیا تو پرنسپل صاحب نے اپنی مرضی سے تاریخ اور سال لکھا۔ قاصر صاحب کا قد باقی بچوں کی نسبت لمبا تھا لہٰذا ان کی عمر دو، تین سال زیادہ لکھی گئی۔ (قاصر صاحب کا قد "6.3" چھے اعشاریہ تین تھا) ڈاکٹر سہیل احمد (پشاور یونیورسٹی - شعبہ اردو) نے اپنے ایم فل کے مقالے "غلام محمد قاصر - فن اور شخصیت" کی تکمیل کے دوران پہاڑ پور کے اس ہائی سکول اور متعلقہ محکمے سے جب غلام محمد قاصر کی تاریخ اور سنہ پیدائش کا کھوج لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا تمام ریکارڈ تلف ہو چکا ہے۔ لہٰذا

قاصر صاحب کے قریبی احباب اور ان کے خانوادے سے تصدیق کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی کہ ان کی تاریخ، ماہ اور سنہ درست درج نہیں ہیں لیکن وہ درحقیقت ہیں کیا؟، یہ معلوم نہیں البتہ ڈاکٹر سہیل احمد کی تحقیق کے مطابق سنہ 44/1943ء بنتا ہے اور انٹرنیٹ پر بعض مقامات پر سال 1944ء درج ہے۔ تاہم ان کی کتابوں پر وہی تاریخ درج ہے جو ان کی تعلیمی اسناد پر موجود ہے۔ غلام محمد قاصر اپنی ایک تحریر میں قلم طراز ہیں:

"میری پرورش ایک ایسے قصبے میں ہوئی جہاں ریل گاڑی تو اب بھی نہیں ہے۔ ہمارے زمانہ طالب علمی تک وہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ یہ قصبہ ڈیرہ اسماعیل خان ضلع میں ہے اور پہاڑ پور کہلاتا ہے۔ پہاڑ پور میں ایک ہائی سکول ہے جس سے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ لیکن اردو میں نے صرف آٹھویں جماعت تک پڑھی۔ بعد میں اردو کے مقابلے میں سائنس لے لی اور میٹرک کے بعد مدرس کے طور پر سرکاری ملازمت شروع کر دی۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر ایم اے اردو تک کا امتحانات پاس کیے۔ پہاڑ پور میں شاعری کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ وہاں تعلیم بھی زیادہ نہ تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب پہاڑ پور کے ایک نوجوان نے ایم اے کا امتحان پاس کیا، انہی دنوں ایک زمیندار نے چودہ سو روپے کے عوض ایک بیل خریدا تھا اور لوگ دور دور کے دیہات سے سولہویں جماعت پاس آدمی اور چودہ سو روپے کے بیل کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے"(1)

غلام محمد قاصر کا بچپن عسرت اور یتیمی میں بسر ہوا، جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو قاصر کی عمر صرف تین برس تھی۔ ان کی والدہ نے بہت مشکل حالات میں ان کی پرورش کی۔ قاصر صاحب ان لوگوں میں سے نہیں تھے، جو حالات بہتر ہو جانے پر اپنے گزشتہ حالات پر بات کرتے ہوئے کتراتے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے تمام انٹرویوز میں اپنے مشکل اور تکلیف دہ بچپن کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مشہور و معروف نظم "ایک ذاتی نظم" میں جہاں وہ اپنی

بہادر اور مثالی والدہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے وہیں وہ "فاقہ زدہ بچپن" کو بھی یاد کر کے بتاتے ہیں کہ کس طرح ان کی والدہ نے کٹھن حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری۔ غلام محمد قاصر نے پہاڑ پور کے جس سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، میٹرک کے بعد اسی سکول میں بطور معلم مقرر ہوئے اور ساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر ایم اے اردو تک کے امتحانات پاس کیے اور پھر کچھ عرصہ بعد لاہور میں آڈٹ کے محکمے میں ملازمت کی۔ لاہور کا یہ دور، وہ ہے کہ جب پاک ٹی ہاؤس میں کم و بیش تمام اہم شاعر و ادیب آیا کرتے تھے یہ ستر کی دہائی کے اوائل سے وسط تک کی بات ہے۔ لاہور گئے تو پہلے دن حلقہ اربابِ ذوق کی صدارت کا موقع ملا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاصر صاحب ادبی حلقوں کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ اور اس بات کا کریڈٹ احمد ندیم قاسمی کے فنون کو جاتا ہے جس میں قاصر صاحب کی غزلیں ساٹھ کی دہائی کے آخر سے شائع ہونے لگی تھیں۔ جناب مرتضیٰ برلاس، جو ان دنوں ڈیرہ اسماعیل خان میں تعینات تھے انہوں نے احمد ندیم قاسمی کو قاصر صاحب کے اشعار سنائے تو قاسمی صاحب نے بتایا کہ وہ قاصر صاحب کے اشعار پہلے سے سن کر خود ان کی تلاش میں تھے اور پھر انہوں نے قاصر صاحب کو پیغام بھجوایا کہ وہ فنون کے لیے کلام بھیجیں اور پھر قاصر صاحب کے کلام بھیجنے کے بعد جو پہلا خط قاسمی صاحب نے قاصر کو بھیجا وہ "رنگِ ادب قاصر نمبر" میں شامل ہے، جس میں قاسمی صاحب نے قاصر صاحب کی غزلوں کی بے حد تعریف کی۔

یقین کیجئے کہ آپ کی غزل سے بہت متاثر ہوا ہوں، یہ غزل فنون کے تازہ شمارے میں آ رہی ہے جو غالباً دو تین روز کے اندر پوسٹ ہو گا۔ آپ یقین کیجئے، آپ کی غزل میں، میں نے جو انفرادی لہجہ سنا ہے وہ بے حد دل آویز ہے۔ دعا ہے آپ کا فن روز بروز نکھرتا چلا جائے۔(2)

قاصر صاحب کوئی ڈیڑھ دو برس ہی لاہور میں رہے لیکن اس عرصے کو وہ اپنی زندگی کا اہم سرمایہ گردانتے تھے اور پھر لیکچرار شپ کے لیے دیے گئے ایک انٹرویو کے نتیجے میں انہیں لیکچرار شپ کے لیے کال آئی، وہ لاہور نہیں چھوڑنا چاہتے تھے لیکن احمد ندیم قاسمی اور سید افتخار شبیر جیسے مخلص احباب نے پاکستان ریلوے آڈٹ کی ملازمت چھوڑ کر لیکچرر شپ جوائن کرنے کا مشورہ دیا۔ قاصر صاحب زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کالج گئے تو پڑھنے نہیں بلکہ پڑھانے گئے۔اس سلسلے میں پروفیسر نذیر تبسم کو دیے گئے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

میٹرک تک بہ مشکل میں نے تعلیم حاصل کی، باقاعدہ گورنمنٹ ہائی سکول پہاڑپور میں،اس کے بعد میں ٹیچر ہو گیا اسی ہائی سکول میں،اس کے بعد پھر مختلف جگہوں پر ملازمت بھی کرتا رہا اور ساتھ پرائیویٹ امتحان بھی دیتا رہا،اس طرح میں نے ایم اے پاس کر لیا پھر اللہ تعالی کا کرم ہوا کہ میری اپوائنٹمنٹ ہو گئی لیکچرار کے طور پر۔ تو کالج میں، میں جب پہلے دن گیا تو پڑھنے نہیں بلکہ پڑھانے کے لئے گیا۔(3)

گورنمنٹ کالج مردان میں، ۱۹۷۵ میں ان کی پہلی تعنیاتی ہوئی، غلام محمد قاصر کے مردان کے قیام کے دوران ہی اُن کی والدہ کا انتقال 1977 میں ہوا۔ اسی برس ان کا پہلا شعری مجموعہ تسلسل شائع ہوا۔ کچھ عرصے بعد ۲۰ نومبر ۱۹۷۸ کو ان کی شادی محترمہ سلمی بیگم سے ہوئی جو معروف شاعر اور سول سرونٹ جناب سعید احمد اختر کی صاحب زادی اور منفرد شاعر (اور بعد میں سول سرونٹ) جناب خاور احمد کی ہمشیرہ ہیں ۔ آپ کے چھوٹے بھائی امجد سعید اختر انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں، سعید احمد اختر ان دنوں مانسہرہ میں ڈی سی کے عہدے پر تعینات تھے اور ان کا شعری مجموعہ دیار شب شائع ہو چکا تھا۔اس شادی کی رپورٹنگ ایک معروف اخبار نے ان الفاظ میں کی:

غلام محمد قاصر کی شادی خانہ آبادی ۲۰ نومبر کو ہو رہی ہے، ۱۹ نومبر کو تسلسل کے اس شاعر کی بارات مردان سے روانہ ہو گی اور ایبٹ آباد میں دیار شب کے شاعر سعید احمد اختر کے ہاں پہنچے گی۔(4)

ایک دلچسپ امر یہ بھی رہا کہ غلام محمد قاصر نے اپنے ولیمے کے دن بھی کالج سے چھٹی نہیں کی اور دن کو کالج گئے اور شام کو ولیمہ رکھا گیا۔ مردان میں قاصر کی رہائش بکٹ گنج بازار کے قریب ایک محلے میں رہی۔ 1980 میں ان کے ہاں پہلے بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ عماد نام رکھا گیا۔ بچے کی پیدائش پر شعراء واد باء کی جانب سے مبارک باد کے خطوط بھی موصول ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی اور جلیل عالی کے خطوط قاصر نمبر میں شامل ہیں:

عزیز نومولود کی دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ عماد بہت پیارا نام ہے۔ اللہ برکت دے۔(5)

عماد کی پیدائش کے ایک برس بعد قاصر کے ہاں دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام عدنان رکھا گیا۔ ۱۹۸۱ میں قاصر کا تبادلہ مردان سے پشاور ہو گیا ہے اور وہ سپیریئر سائنس کالج پشاور میں پڑھانے لگے اس دوران قاصر کی رہائش بھانہ ماڑی، رام داس" بازار کے پاس رہی اور کچھ برس کے بعد مرشد آباد، کوہاٹ روڈ بالمقابل سول کالونی میں رہائش میں رہی۔ تین برس سپیریئر سائنس کالج پشاور میں تعینات رہنے کے بعد قاصر کا تبادلہ درہ آدم خیل ہو گیا۔ رہائش پشاور ہی میں رہی کہ نیا کالج پشاور سے کوئی ۲۰ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ قریب ساڑھے تین چار سال قاصر گورنمنٹ کالج درہ آدم خیل میں تعینات رہے۔ اس دوران اُن کے ہاں اُن کی اکلوتی بیٹی کی پیدائش ہوئی جس کا نام قاصر نے اپنی پسند سے نیلم رکھا۔ عماد اور عدنان کے نام بالترتیب بچوں کی خالہ اور نانی نے تجویز کیے تھے۔ بیٹی کی پیدائش پر شعراء اور ادبا کی طرف سے مبارکباد کے خطوط موصول ہوئے۔ قاصر کا دوسرا شعری مجموعہ "آٹھواں آسماں بھی نیلا ہے، اسی زمانے میں شائع ہوا۔ ان کی معروف نظم

سمیتا پاٹل جس کا پس منظر راقم کے مضمون قاصر کی شاعری میں پیراسائیکالوجی میں موجود ہے اسی دور کی ناقابل فراموش نظم ہے۔ جب قاصر پشاور سے درہ آدم خیل جایا کرتے تھے۔ درہ آدم خیل سے قاصر کا تبادلہ گورمنٹ کالج پشاور میں ہوا، جہاں اُن کے رفقائے کار میں ناصر علی سید، سید جمیل حسین کاظمی، شریف گل اور ایلون ایڈون سمیت اہم شخصیات شامل تھیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد اور پروفیسر شاہ سعود بھی ان دنوں وہاں زیر تعلیم تھے۔ اس دوران ۱۹۹۲ میں غلام محمد قاصر نے پشاور کے علاقے حیات آباد میں اپنا گھر تعمیر کیا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ دو سوا دو سال بعد قاصر صاحب کا تبادلہ گورنمنٹ کالج طورو (مردان) ہوا۔ طورو کے حوالے سے کچھ اہم واقعات کا تذکرہ ضروری ہے کام جب کے ایک شاگرد جناب پیرزادہ جو وہاں صرف ایک برس قاصر صاحب سے پڑھتے رہے، نے قاصر جب کے انتقال کے بعد طورو میں ایک رجسٹرڈ اکیڈمی غلام محمد قاصر اکیڈمی " کے نام سے بنائی جو متعلقہ بورڈ سے منسلک ہے اور وہاں میٹرک تک تعلیم دی جاتی ہے۔

قاصر کے پاس گاڑی نہیں تھی اور وہ پبلک ٹرانسپورٹ سے طورو جایا کرتے تھے اور حیات آباد سے پہلے بس میں پشاور کے اڈے تک، وہاں سے مردان کے لئے وین / HAICE میں اس کے بعد مردان سے طورو تک الگ وین میں، جاتے۔ طورو پہنچ کر وہاں سے کالج تک تانگے میں جاتے اور جہاں تانگے کا آخری سٹاپ تھا وہاں سے آگے کچھ منٹ پیدل چلنے کے بعد کالج تک پہنچتے تھے۔ یعنی چار سواریاں بدل کر اور پیدل چلنے کے بعد کالج تک پہنچتے۔ طورو میں تقرری کے دوران ایک دن بھی چھٹی نہیں۔ شدید بارش کے دنوں میں کبھی اگر والدہ کہہ دیا کریں کہ آج اتنی سواریاں بدل کر جائیں گے چھٹی کر لیں تو قدرے ناراضی سے کہتے کہ اگر میں چھٹی کر لوں تو جو طالب علم وہاں پڑھنے آئے ہوں گے اُن کی تعلیم کا حرج ہو گا اور کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کالج میں ایسے دنوں میں کوئی ایک طالب علم بھی

نہیں آیا اور قاصر کلاس روم میں اکیلے بیٹھے رہے اور لیکچر کا وقت پورا ہونے کے بعد واپس آئے۔ گورنمنٹ کالج طورو کے بعد غلام محمد قاصر کا تبادلہ ۱۹۹۶ میں گورنمنٹ ڈگری کالج پبی (نوشہرہ) ہوا۔ یہ قاصر کی آخری تقرری تھی۔ دو سال بعد یعنی 1998ء میں انھیں اور حلقہ ارباب ذوق نیو یارک سے اُردو کانفرنس اور مشاعرے کا دعوت نامہ موصول ہوا اور قاصر اُس میں شرکت کے لیے نیو یارک گئے۔ وہاں جناب جوہر میر صاحب ان کے مرکزی میزبان تھے (پشاور سے تعلق رکھنے والے معروف لکھاری، شعر بھی ہے کہتے تھے اور کالم نگار بھی تھے) قاصر صاحب کی امریکہ ہی میں کہی گئی ایک غزل میں ان کا نام بھی موجود ہے:

قاصر نے تو دیکھا ہے اب تک فاقوں کا رقص
جوہری طاقت کیا ہے جوہر میر سے پوچھتے ہیں

ان کے علاوہ راشد مراد، عقیق صدیقی، اشرف میاں، تنویر شاہ سے ملاقاتیں ہیں۔ قاصر کو امریکہ کی میں مختلف مشاعروں میں بے حد پذیرائی ملی۔ انہوں نے بہت سے اجلاس اور ادبی نشستوں کی صدارت بھی کی۔ شاعری کے علاوہ قاصر صاحب کی پیراسائکالوجی میں دلچسپی اور مہارت سے وہاں کے احباب نے بہت کچھ سیکھا (تفصیل قاصر نمبر کے مختلف مضامین اور خطوط میں دیکھی جاسکتی ہے)۔ امریکہ میں قاصر اپنے برادر نسبتی امجد سعید اختر کے ہاں بھی رہے، قریب دو ماہ امریکہ میں گزار کر وہ اگست 1998 میں پاکستان واپس تشریف لائے۔ کچھ عرصے بعد اُنھیں سینے سے ذرا نیچے داہنی طرف درد کی شکایت محسوس ہوئی۔ شروع میں سنجیدہ نہیں لیا لیکن جب درد بڑھنے لگا تو اپنے دوست اور معروف ڈرامہ نگار جناب ڈاکٹر ڈینس آئزک، جو پشاور میں ریڈیالوجسٹ بھی تھے، سے ابتدائی تشخیصی ٹسٹ کروائے۔ ڈاکٹر علی رضوی (جو جلیل رضوی کے فرزند ہیں، اور جلیل رضوی، جناب سعید احمد

اختر کے ساتھ ڈیرہ اسماعیل خان کالج میں پڑھاتے تھے اور دونوں کے خاندانوں میں اگرچہ کوئی خونی رشتہ داری تو نہ تھی لیکن نسبت اور تعلق اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یوں ڈاکٹر علی رضوی کے قاصر کے برادر نسبتی جیسے تھے)، کے علاوہ ڈاکٹر زاہد اسلم اعوان بھی اگرچہ براہ راست معالج نہیں تھے مگر قاصر کے آخری مہینوں میں رابطے میں رہے۔ اور ڈینس آئزک سے کرائے گئے ٹیسٹ کے نتائج دیکھ کر ڈاکٹرز کو تشویش ہوئی اور کچھ مزید ٹیسٹ کروائے گئے۔ غلام محمد قاصر کو جگر کا کینسر تشخیص ہوا اور وہ بھی آخری سٹیج پر تھا واضح رہے کہ اس وقت اس کینسر کا علاج امریکہ میں بھی بہت ابتدائی اور تجرباتی مراحل میں تھا۔ قاصر کی رپورٹس علی رضوی نے امریکہ میں امجد سعید اختر (قاصر کے برادر نسبتی) کو بھی بھیجیں ہوا کہ وہ وہاں پر کسی ڈاکٹر سے بات کریں۔ اس موقع پر سعید احمد اختر صاحب نے کہا کہ اگر قاصر کے مرض کا علاج ممکن ہے تو وہ اس کی خاطر اپنا گھر اور تمام اثاثہ جات بیچنے کو تیار ہیں تاہم اس وقت تک اس موذی مرض کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا تھا، یہاں اہم بات یہ ہے کہ یہ بات قاصر کے اہل خانہ بالخصوص اُن کے بچوں کو نہیں بتائی گئی۔ ڈاکٹر علی رضوی نے قاصر صاحب کے سسر جناب سعید احمد اختر، برادر نسبتی خاور احمد ان کے قریبی دوستوں محمد اسلم بلوچ، عزیز خٹک، پروفیسر فضل ربی اور طارق احد نواز کو معاملے کی سنگینی سے آگاہ کیا کہ قاصر صاحب کے پاس بہ مشکل دو سے تین ماہ باقی ہیں، یہ نومبر ۱۹۹۸ کے آخری عشرے کی بات ہے۔ قاصر کے متذکرہ احباب جو ان دنوں پشاور ہی میں مقیم یا تعینات تھے نے یہ یہ فیصلہ کیا کہ قاصر کو دفتر سے چھٹی دلوا کر انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ پر راضی کیا ریٹائر منٹ کے بعد جو پیسے ملنے ہوتے ہیں وہ پورے ملیں ورنہ نوکری کے دوران وفات کے بعد وہ پیسے کم ہو جاتے۔ دوستوں کی متفقہ رائے تھی کہ قاصر کے بعد اُن کی بیوہ اور بچوں کے لیے جو ممکن ہو کیا جائے قاصر کی طبیعت روز بروز خراب ہوئی چلی گئی اور وہ ہر عیادت کرنے

آنے. والے سے یہی کہتے رہے کہ "کل سے بہتر ہوں۔ بیماری کے دنوں میں قاصر صاحب نے جس صبر کا مظاہرہ کیا وہ نا قابل یقین ہے۔ جو شخص جوان سے ان دنوں میں ملا وہ اس بات کا گواہ ہے اور کچھ گواہی قاصر نمبر میں تاثرات میں موجود ہے۔ اسی دوران پی ٹی وی پشاور سے ایک نعتیہ مشاعرے کی دعوت موصول ہوئی۔ قاصر جب نے کہا کہ اگر اور کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ انکار بھی کر دیتے لیکن نعت کی بات ہے تو دعوت قبول کی ۔ نئی نعت لکھی اور مشاعرے میں پڑھی:

دن کو دن، رات کو جو رات نہیں لکھ سکتا
ایسا فن کار کبھی نعت نہیں لکھ سکتا(6)

یہ نعت قاصر صاحب کی آخری تخلیق ثابت ہوئی۔ 19 فروری کی شام پروفیسر ایلون ایڈون قاصر صاحب سے ملنے آئے، گلدستہ پیش کیا Get well soon کا کارڈ دیا اور پھر قاصر کے کمرے سے ڈرائنگ روم میں آکر ڈاکٹر علی رضوی سے پوچھا کہ قاصر کی طبیعت کے بارے میں بتائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے راقم کو جیب سے پیسے نکال کر دیے اور باہر سیگریٹ لانے کو کہا۔ راقم واپس آیا تو پروفیسر الیون ایڈون چہرے کے تاثرات نے گویا سب بتا دیا۔ ڈاکٹر صاحب سگریٹ لے کر باہر چلے گئے اور ڈرائنگ روم میں اڈون صاحب اور راقم رہ گئے ۔ایڈون صاحب نے کہا: عماد بیٹا ہمیں بعض موقعوں پر تقدیر سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے اور سمجھوتا کرنا بزدلی نہیں بلکہ مشیت کی ہاں میں ہاں ملانا ہے۔ اگلے دن یعنی 20 فروری ۱۹۹۹ء بروز ہفتہ دن دو بج کر بچیس منٹ پر قاصر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اسی رات نو بجے ان کا جنازہ تھا، جس میں شعرا و ادبا سمیت مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان سے ان کے انتقال کی خبر اور خصوصی

پروگرام نشر ہوئے اور متعدد انگریزی اور اردو اخبارات نے اس خبر کو تفصیل سے شائع کیا۔ کئی مہینوں تک ان کی یاد میں تعزیتی ریفرنس اور پروگرام منعقد کیے جاتے رہے۔

انہیں حیات آباد پشاور کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا اور ان کی قبر پر ان ہی کا ایک شعر زراسی تبدیلی کے ساتھ درج ہے:

بس اب تو اک نشانی رہ گئی ہے
یہیں قاصر تمہیں اکثر ملے گا

☆اصل شعر میں وہیں درج ہے۔

شاعری:

قاصر صاحب کی شاعری کی اولین کوششیں فلمی دھنوں پر فضائل و مصائب اہل بیت کا بیان ہے جو سرائیکی اور اردو میں ہیں۔ انہوں نے ایک مقام پر خود تحریر کیا:

میری شاعرانہ تربیت میں ہیمنت کمار، نوشاد اور شنکر جے کشن کی موزوں کی ہوئی دھنوں نے اہم رول ادا کیا ہے جنہیں میں آج بھی اپنی دھڑکنوں کے قریب محسوس کرتا ہوں۔(7)

فلمی موسیقی انہیں پسند تھی۔ آل انڈیا ،ریڈیو سیلون ،اقاعدگی سے سنتے تھے سوائے ایام عزاء کے ریڈیو پر گانوں کے پروگرام سُنتے تھے۔ آڈیو کیسٹ بھی ریکارڈ کروائی تھیں جن میں ان کے پسندیدہ گانے، ہوا کرتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ بہت سی فلمیں صرف گانوں کے لیے یا بعض دفعہ صرف کسی ایک گانے کے لیے دیکھیں۔ پاکستانی نغمہ نگار، جنہوں نے فلموں کے لئے گیت نگاری کی، میں بالخصوص قتیل شفائی صاحب سے کے لکھے ہوئے گیت پسند تھے جیسے؛ تیرے در پر صنم، زندگی میں تو سبھی، بانٹ رہا تھا جب خدا وغیرہ شامل ہیں۔

قاصر صاحب نے اپنی پہلی غزل اشاعت کے لئے ایک فلمی پرچے کو بھجوائی تھی، بعدازاں پشاور سے شائع ہونے والے ایک روزنامہ میں ان کا کلام باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں قیام کے دوران اپنی چند غزلیں بغیر کسی تعارف کے احمد ندیم قاسمی کو بھجوائیں انہوں نے بہت حوصلہ افزائی اور پزیرائی کی، یوں قاصر صاحب کا کلام اردو کے سب سے اہم رسالے فنون میں چھپنے لگا۔

تصانیف، ادبی خدمات واعزازات:

تسلسل

غلام محمد قاصر کا کلام مختلف ادبی رسائل بالخصوص فنون میں ساٹھ کی دہائی کے آخر میں شائع ہونے لگا تھا—جب ستر کی دہائی کے وسط میں وہ کچھ عرصہ لاہور میں قیام پذیر رہے تو احمد ندیم قاسمی سے فنون کے دفتر سے ملنا گویا معمول بن گیا تھا۔ 1977ء میں غلام محمد قاصر کی والدہ کا انتقال ہوا اور وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ والدہ ہی وہ واحد ہستی تھیں جنہوں نے قاصر صاحب کو اس مقام تک پہنچانے کے لیے سب سے زیادہ قربانی دی۔ والدہ مرحومہ کا غم ایسا نہیں تھا کہ اس کے اثر سے قاصر صاحب جلد نکل سکتے تاہم اس غم کی کیفیت میں کچھ لمحوں کے لیے خیال بدلنے کی غرض سے اپنے اولیں شعری مجموعے پر کام شروع کیا۔ اُن کا اکثر کلام تب تک نہ صرف شائع ہو چکا تھا بلکہ اہم ادبی شعراء و نقاد انھیں ان کے شعر کے سبب نہ صرف جانتے تھے بلکہ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مکتبہ فنون کے زیر اہتمام 1977ء میں شائع ہونے والے غلام محمد قاصر کے پہلے شعری مجموعے "تسلسل" کا دیباچہ احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیا اور فلیپ پر ڈاکٹر سید عبداللہ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، احسان دانش، ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، رئیس امروہوی، ظفر اقبال، شہزاد احمد، قتیل شفائی، فارغ بخاری، احمد راہی، عبدالعزیز خالد، اور شباب کیرانوی

جیسے اکابرین ادب کی گرانقدر رائے موجود ہے۔اس مجموعے کی ایک اور اہم بات یہ بھی تھی کہ معروف مصور و خطاط اسلم کمال نے اس مجموعے کا سرورق، پس ورق اور کئی اشعار کے لیے فن پارے تخلیق کیے جو نہ صرف کتاب میں شامل تھے بلکہ انہیں بھی کلام کے ساتھ بہت پسند کیا گیا۔ مجموعے کا انتساب ان کی والدہ کے نام تھا۔ جون 1998ء میں جب غلام محمد قاصر، امریکہ کے دورے پر روانہ ہونے لگے تو بختیار سنز پشاور سے اس مجموعے کی دوسری اشاعت منظر عام پر آئی۔ پہلی اشاعت میں برگِ سبز (گنے کے رس جیسا رنگ) جب کہ دوسری اشاعت میں نارنجی رکھا گیا۔

آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے:

غلام محمد قاصر کا دوسرا شعری مجموعہ "آٹھواں آسماں بھی نیلا ہے" فطرت پبلی کیشنز لاہور سے جولائی 1988ء میں شائع ہوا۔ "ایک سوئے اتفاق کہہ لیجیے کہ ان دو مجموعوں کے درمیان جو وقفہ ہے وہ وہی دور ہے جسے سیاہ دور کہا جاتا ہے اور اس مجموعے کی غزلوں نظموں میں بھی آپ کو اس دور کی مناسبت سے کلام ملے گا۔"

مثالی مثال کے طور پر یہ شعر:

اب مرے شہر کی پہچان ہے اک وعدہ شکن
شہریت بدلوں کہ تاریخ کا انکار کروں(8)

پہلے مجموعے میں بحروں کے حوالے سے تجربات زیادہ تھے۔ تیس سے زائد بحریں استعمال کی گئیں جن میں بعض اردو کے لیے بالکل اجنبی تھیں، مجھے یاد ہے کہ قاصر صاحب

کی تسلسل کی غزل "ورائے بزمِ نجم و قمر اندھیرا دیکھتا ہی نہیں" اور "کھلے تھے لفظ گلابوں کی داستاں کے لیے" میں بالترتیب غیر مانوس بحر اور جان گسل، ہئیتی تجربہ شامل تھا۔

دوسرے مجموعے کا انتساب قاصر صاحب کی اہلیہ سلمیٰ قاصر کے نام ہے۔اس مجموعے میں موضوعات کا تنوع زیادہ ہے۔

اس مجموعے کو اباسین آرٹس کونسل پشاور کی طرف سے سال 1988-89 میں شائع ہونے والے بہترین مجموعے کا اعزاز (گولڈ میڈل) بھی دیا گیا۔

دریائے گماں:

غلام محمد قاصر کی زندگی میں شائع ہونے والا ان کا تیسرا اور آخری مجموعہ "دریائے گماں" تھا جو 1997ء میں الحمد پبلیکیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا انتساب ان کے بچوں عماد، عدنان اور نیلم کے نام ہے۔ اس مجموعے کو "پروین شاکر ٹرسٹ اسلام آباد" کی طرف سے سال 1997ء کی بہترین شاعری کی کتاب کا اعزاز "پروین شاکر عکس خوشبو ایوارڈ" بھی عطا کیا گیا۔

مجھے یاد ہے کہ اگست 1996ء میں پی ٹی وی کوئٹہ سینٹر پر کل پاکستان مشاعرے کے لیے پشاور سے قاصر صاحب کو بھی دعوت دی گئی۔ اس مشاعرے کی نظامت اوریا مقبول جان (جو ان دنوں کوئٹہ میں تعینات تھے) کر رہے تھے جب کہ بہت اہم اور سینئر شعراء اس مشاعرے میں موجود تھے جن میں احمد فراز، جمیل الدین عالی، تابش دہلوی، سعید احمد اختر، نصیر ترابی، حسن رضوی شامل تھے۔ یہ وہی یادگار ترین مشاعرہ ہے جہاں غلام محمد قاصر نے پہلی مرتبہ اپنی شہرہ آفاق غزل "بغیر اس کے اب آرام بھی نہیں آتا" پیش کی (ویڈیو یوٹیوب پر موجود ہے)۔ مشاعرے کے بعد جب شعراء آپس میں گفتگو کر رہے تھے تب احمد فراز صاحب نے قاصر صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ "میں آپ سے خفا ہوں"۔ یہ

واقعہ خود قاصر صاحب نے سنایا تھا کہ فراز صاحب کے اس جملے پر قاصر صاحب اور سعید احمد اختر (قاصر صاحب کے سسر اور احمد فراز کے اسلامیہ کالج پشاور کے زمانے کے دوست) بھی حیران ہوئے کہ آخر فراز صاحب نے ایسا کیوں کہا۔ جب قاصر صاحب نے وجہ پوچھی تو احمد فراز صاحب نے جواب دیا کہ خیبر پختونخوا (جس وقت صوبہ سرحد تھا) میں میرے بعد صرف ایک ہی شاعر ہے جو اچھا لکھتا ہے اور میں خفا اس لیے ہوں کہ وہ کم لکھتا ہے کتنے سال ہو گئے آپ کی شاعری کی نئی کتاب نہیں آئی۔ اب آپ کی کتاب جلد آنی چاہیے۔ یہ واقعہ نانا بابا سعید احمد اختر نے بھی سنایا تھا۔ اس بات کے بعد قاصر صاحب جب کوئٹہ سے واپس پشاور آئے تو اس بات کا تذکرہ کیا اور پھر اپنی بیاضیں نکالیں اور کہنے لگے کہ اتنا کلام ہے کہ کتاب لائی جا سکتی ہے۔ یوں فراز صاحب کے حکم پر قاصر صاحب نے مسودہ تیار کر کے صفدر حسین (الحمد پبلیکیشنز) کو بھجوایا۔

یہاں ایک اہم واقعے کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ قاصر صاحب اس مجموعے کی اشاعت کے دو برس بعد یعنی 1999ء (20 فروری) کو قاصر صاحب کا انتقال ہوا۔

بعد از وفات شائع ہونے والی کتب

کلیاتِ قاصر

قاصر صاحب کے انتقال کے بعد، ہمیں اس بات کا مسلسل احساس رہا کہ ان کا شعری سرمایہ کو یکجا کر کے کلیات کی شکل میں شائع کرنا بہت ضروری ہے۔ غلام محمد قاصر کے تین مجموعوں کے علاوہ ان کا غیر مطبوعہ و غیر مدون کلام بھی ہمارے پیشِ نظر تھا اور پھر ہم نے ایک کمیٹی جس میں سعید احمد اختر، خاور احمد، منظر نقوی، طارق ہاشمی، شوق جعفری، سہیل احمد اور عزیز خٹک شامل تھے ان کے مشورے سے کلیاتِ قاصر کی ترتیب و تدوین کی ۔کلیاتِ قاصر کی اہم بات یہ تھی کہ اس کے عنوان "اک شعر ابھی تک رہتا ہے (کلیاتِ

قاصر)"، سمیت پیش لفظ، آراء، غیر مطبوعہ و غیر مدون حصوں کے عنوانات تمام قاصر صاحب کے مصرعوں سے اخذ کیے تھے۔ ایلیا بکس راولپنڈی سے یہ کتاب 2019ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ کتاب کا سرورق عماد قاصر نے بنایا۔ پسِ ورق پر قاصر صاحب کے کوائف اور فلیپ پر ان کے 12 اشعار درج ہیں۔ پیش لفظ قاصر صاحب کے بچوں (عماد، عدنان اور نیلم) نے تحریر کیا۔

اپریل 2018ء میں رنگِ ادب پبلیکیشنز کراچی سے کلیاتِ قاصر "اک شعر ابھی تک رہتا ہے، کی دوسری اشاعت منظرِ عام پر آئی۔ اس اشاعت میں جناب اسلم کمال کے فن پارے جو پہلے مجموعے "تسلسل" میں شامل تھے وہ بھی شامل کیے گئے۔ کلیات کی دونوں اشاعتوں میں بک مارک (جس کی دونوں اطراف قاصر صاحب کے اشعار درج ہیں) شامل کیے گئے۔ دوسری اشاعت کا پیش لفظ قاصر صاحب کی اہلیہ سلمیٰ قاصر نے تحریر کیا ہے۔

منتخب کلام غلام محمد قاصر

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی پاکٹ سائز منتخب کلام کی سیریز کے تحت اگست 2016ء میں منتخب کلام غلام محمد قاصر شائع ہوا۔ جس میں کلام کا انتخاب ڈاکٹر شہاب صفدر نے کیا۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر انعام الحق جاوید (ایم ڈی این بی ایف) نے تحریر کیا۔ ڈاکٹر شہاب صفدر کا تحریر کردہ تعارفی مضمون بھی شاملِ اشاعت ہے

سرِ شاخِ یقیں:

اگست 2021ء میں غلام محمد قاصر کی کلیات میں سے تمام تقدیسی کلام (حمد و نعت، سلام و منقبت) کو یکجا کر کے ایک الگ مجموعے کی صورت میں رنگِ ادب پبلیکیشنز کراچی سے شائع کیا گیا۔ اس کا عنوان بھی قاصر صاحب کی ایک حمد کے شعر سے لیا گیا ہے۔ سرورق عماد قاصر نے بنایا ہے اور کتاب کا پیش لفظ عماد، عدنان اور نیلم نے تحریر کیا ہے۔

کتاب میں جناب افتخار عارف، منظر نقوی اور صبیح رحمانی کی قاصر صاحب کی تقدیسی شاعری پر تحاریر بھی شامل ہیں۔

رنگِ ادب غلام محمد قاصر نمبر:

قاصر صاحب کی شاعری "اک شعر ابھی تک رہتا ہے (کلیاتِ قاصر)" کی شکل میں محفوظ ہو چکی تھی لیکن اس تمام عرصے میں یہ خیال بھی پیشِ نظر رہا کہ اگرچہ شاعری ہی غلام محمد قاصر کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہے تاہم انہوں نے کچھ نثر بھی لکھی، جیسے پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان کے لیے مختلف ڈرامے اور پروگرام، پھر کچھ شعری مجموعوں کے دیباچے، بعض اہل قلم پر مضامین۔ ان کی اپنی تحریروں کے علاوہ ان کی لائبریری میں بہت سے مشاہیرِ ادب کے خطوط بھی موجود تھے۔ قاصر صاحب کی تصاویر بھی ہماری خواہش تھی کہ محفوظ ہو جائیں۔ ان کے علاوہ قاصر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فن و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر کئی اہم تحریریں بھی منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔ اس تمام مواد کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ قاصر صاحب کے اہل خانہ نے کیا، کہ یہ سب مواد ان کے پاس تھا اور اس حوالے سے جب رنگِ ادب پبلیکیشنز کے روحِ رواں اور شاعر و نقاد جناب شاعر علی شاعر سے رابطہ کیا گیا، جو اس سے پیشتر "اک شعر ابھی تک رہتا ہے (کلیاتِ قاصر)" اور "سرِ شاخِ یقیں" بہت سلیقے سے اور قرینے سے شائع کر چکے تھے، تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ایک الگ کتاب کی بجائے اگر یہ تمام مواد ان کے ادارے کے تحت شائع ہونے والے معروف ادبی رسالے "رنگِ ادب" کے خصوصی نمبر (غلام محمد قاصر) نمبر کی صورت میں سامنے لایا جا سکتا ہے۔ یوں یہ تمام مواد مئی 2022 میں رنگِ ادب (کتابی سلسلہ 65)۔ اپریل تا جون 2022 "غلام محمد قاصر نمبر" کی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے مدیر اعزازی

شاعر علی شاعر ہیں۔ جہازی سائز کے کاغذ پر 720 صفحات کا یہ شمارہ اپنی اشاعت کے پہلے دن سے ہی محققین و مداحین کی خصوصی توجہ حاصل کر رہا ہے۔

تلمیحاتِ قاصر از ڈاکٹر شفیق الرحمن الہ آبادی:

فروری 2025ء میں رنگِ ادب پبلیکیشنز کراچی سے "تلمیحاتِ قاصر" کے نام سے کتاب شائع ہوئی جس کے مصنف ڈاکٹر شفیق الرحمن الہ آبادی ہیں، کتاب کا مقدمہ جناب شاعر علی شاعر نے تحریر کیا ہے۔ مصنف ڈاکٹر شفیق الرحمن نے نہایت عرق ریزی سے کلامِ قاصر کا مطالعہ کر کے اس میں سے مذہبی، تاریخی، مکانی، لوک داستانوی، ادبی تلمیحات کو یکجا کیا ہے۔ یہ ایک بہت منفرد کتاب اور غلام محمد قاصر کو ایک عمدہ خراج ہے۔

سُخنِ قاصر کے سو 100 شعار از شاعر علی شاعر:

جناب شاعر علی شاعر نے غلام محمد قاصر کی شاعری کا انتہائی خلوص و باریک بینی سے مطالعہ کیا اور قاصر صاحب کے 100 سے زائد نمائندہ اور معروف اشعار کی تشریح و تفہیم پیش کی ہے۔ کتاب کا مقدمہ اور حاصلِ مطالعہ بھی انہی کے قلم سے تحریر ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں قاصر صاحب کے اشعار کی مختلف جہتوں سے قارئین کو اس طرح روشناس کرایا گیا ہے کہ داد دیے بنا رہنا ممکن نہیں۔ کتاب رنگِ ادب پبلیکیشنز سے شائع ہوئی ہے، پیشِ لفظ محمد حمید شاہد اور اطہر عباسی نے تحریر کیا ہے۔

پاکستانی ادب کے معمار - غلام محمد قاصر - شخصیت اور فن از ڈاکٹر طارق ہاشمی:

اکادمی ادبیات پاکستان کی معروف سیریز "پاکستانی ادب کے معمار" کے تحت ڈاکٹر طارق ہاشمی کی تصنیف "غلام محمد قاصر - شخصیت اور فن" کے عنوان سے 2025 میں منظرِ عام پر آئی۔ دیباچہ ڈاکٹر طارق ہاشمی نے خود تحریر کیا۔ اس کتاب میں قاصر صاحب کی سوانح، ادبی خدمات (شاعری اور نثر سمیت اہل قلم کی رائے اور منتخب کلامِ قاصر بھی شامل ہے۔

اعزازات:

کسی اہلِ قلم کا سب سے بڑا اعزاز تو اس کے حلقہ قارئین کی طرف سے پذیرائی ہوتا ہے لیکن ادبی اداروں اور سرکاری سطح پر اعتراف سخن کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ غلام محمد قاصر کو ان کے فن پر مجموعی طور پر بھی اعزازات سے نوازا گیا اور ان کی کتابوں پر بھی ایوارڈ عطا کیے گئے۔ ذیل میں مذکورہ اعترافات کی تفصیل پیش کی جارہی ہے:

- ا۔ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی (شاعری) حکومت پاکستان (۲۰۰۷ء)
- ۲۔ پروین شاکر عکس خوشبو ایوارڈ برائے بہترین شاعری (دریائے گماں) (۱۹۹۸ء)
- ۳۔ وثیقہ اعتراف (شاعری)، ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی (۱۹۹۴ء)
- ۴۔ بہترین نغمہ نگار ایوارڈ، پی ٹی وی پشاور (۱۹۹۳ء)
- ۵۔ بولان ایوارڈ، بہترین ڈرامہ نگار/شاعری بولان اکیڈمی (۱۹۹۳ء)
- ٦۔ سردار عبدالرب نشتر ایوارڈ (گولڈ میڈل) برائے بہترین شاعری (آٹھواں آسماں بھی نیلا ہے، اباسین آرٹس کونسل پشاور (۱۹۸۹ء)

سلسلہ تحسین:

غلام محمد قاصر کو حرف تحسین پیش کرنے کے لیے ۲۰۰٦ء میں تسلسل کے نام سے پشاور سے ایک کتابی سلسلہ شروع کیا گیا، جس کے پانچ شمارے منظر عام پر آئے تسلسل کے مقبول عامر نمبر اور منیر نیازی نمبر یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ رنگ ادب، کراچی کے کتابی سلسلے کے تحت غلام محمد قاصر نمبر (اپریل تا جون ۲۰۲۲ء) شائع کیا گیا۔

ڈیرہ اسمعیل خان کے نوجوان اہلِ قلم نے ان کے نام پر قاصر ادبی فورم تشکیل دیا، جس کے تحت متنوع ادبی سرگرمیاں ہوئیں اور کتب و جرائد کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا گیا۔ غلام محمد قاصر کا منتخب کلام اسلامیہ کالج یونی ورسٹی، پشاور اور شہید بے نظیر بھٹو ویمن یونی ورسٹی، پشاور اور ہزارہ یونی ورسٹی مانسہرہ کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ طورو

(مردان) میں طلبا و طالبات کے لیے بورڈ آف انٹر میڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، مردان سے میٹرک تک رجسٹرڈ غلام محمد قاصر اکیڈمی ۲۰۰۷ء میں قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ غلام محمد قاصر کا کلام، غلام عباس، سیاں چودھری، بشارت علی، اقبال باہو، اعجاز قیصر گلزار عالم، علی امجد امین قزلباش، شکیلہ ناز، سردار علی ٹکر، کا غلام عباس گل ڈیروی، یسمہ نور اور بھارتی گلوکارہ کویتا سیٹھ نے گایا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ غلام محمد قاصر، پس منظر مشمولہ رنگ ادب قاصر نمبر، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، اپریل تا جون 2022، صفحہ 30

2۔ احمد ندیم قاسمی خط بنام غلام محمد قاصر، مشمولہ رنگ ادب قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اپریل تا جون 2022، صفحہ 463

3۔ غلام محمد قاصر/نذیر تبسم (انٹرویو) مشمولہ رنگ ادب قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اپریل تا جون 2022، صفحہ 169

4۔ نوائے وقت، لاہور 17 نومبر 1977

5۔ احمد ندیم قاسمی خط بنام غلام محمد قاصر مشمولہ رنگ ادب قاصر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اپریل تا جون 2022، صفحہ 464

6۔ غلام محمد قاصر، سرشاخ یقین، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اگست 2021، صفحہ 55

7۔ غلام محمد قاصر، پس منظر مشمولہ رنگ ادب قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی اپریل تا جون 2022، صفحہ 30

8۔ غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، رنگ ادب پبلیکیشنز، کراچی، صفحہ 237

شاعر علی شاعر

محقق، نقد چیف ایڈیٹر، سہ ماہی مجلہ رنگ ادب کراچی

سخن غلام محمد قاصر

Abstract:

Ghulam Mohammqd Qasir was a preeminent twentieth-century Urdu poet whose work seamlessly reconciles classical ghazal traditions with modern existential sensibilities.Qasir was an innately endowed poet (fitri shair) whose verse arises from genuine inspiration (aamad) rather than forced technical effort (aaward).Over a literary career spanning forty years, Qasir demonstrated exceptional mastery over quantitative prosody (ilm-e-arooz), linguistic elegance, and painterly imagery.Qasir's poetry transcends static emotional laments, positioning human nature, dynamic existence, and socio-philosophical commentary at its core.This text undersc Qasiir's profound impact on contemporary Urdu literature, noting that his creative innovations serve as crucial research subjects across Pakistani academic institutions and continue to inform the work of younger generations of poets.

Key word:

Innate Poet, Organic Inspiration , Prosodic Precision, Visual Portraiture ,Aphoristic Versatility, Human-Centric Dynamism.

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنی تعلیم، ذہانت، فن، کمال اور صلاحیت سے شاعر بن جاتے ہیں، اُن میں بہتر وہ ہیں جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آتے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے اس مقولے کی روشنی میں دیکھا جائے تو اچھی شاعری کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت ودیعت کی ہو، قدرت نے اُسے وہ قابلیت، لیاقت اور ذہنی صلاحیت کے ساتھ فن اور کمال اور ذوق وشوق عطا کیا ہو۔ ایسے شعرا کی طبیعت میں موزونیت در آتی ہے، یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ پیدائشی طور پر اُن کی طبیعت میں موزونیت موجود ہوتی ہے۔ اُن کا بولنا، لکھنا پڑھنا اور بات چیت کرنا بھی شاعری بن جاتا ہے، مگر شاعری کو عروضی نظام کی کسوٹی پر پرکھنے اور اُسے شاعری قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ اُسے شعری طور پر ارادتاً منظوم کیا گیا ہو۔ اس میں شعریت ہو، ردیف و قوافی کا اہتمام ہو، الفاظ کے دروبست کا خیال رکھا گیا ہو۔ زبان و بیان پر مہارت ہو، اور الفاظ و محاورات کو برتنے پر دست رس ہو، اور اُن کی نشست و برخاست کے آداب سے واقفیت ہو۔ تعقید لفظی سے بچا گیا ہو۔

اس تمہید کی روشنی میں اگر غلام محمد قاصر کی شخصیت فن اور تخلیقات شعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ غلام محمد قاصر وہ شاعر ہیں جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آئے ہیں۔ اُن کی عبقریت میں ذرہ برابر بھی شک نہیں ہے۔ وہ

متعدد مجموعہ ہائے کلام کے خالق ہیں۔اُن کے تمام مجموعہ ہائے کلام میں سے کوئی بھی اُٹھا کر پر کچھ لیجیے اُس میں تمام شعری لوازمات، فنی محاسن، فکر کی گیرائی، افکار کی وسعت، الفاظ کی گہرائی (معانی و مفہوم کے لحاظ سے) نظر آئے گی

اداسی موقلم ہے رنگ میں نقش ملال اترا
تمناؤں کے پس منظر سے دل کے پیش منظر تک (۱)

غلام محمد قاصر جیسے عبقری شعرا کی شاعری میں آورد کا نہیں آمد کا دخل ہے۔ایسے شعرا کی قدرتی طور پر بھی مدد ہوتی ہے کہ انھیں الہامی طور پر نادر تخیلات سے نوازا جاتا ہے۔ خیالات کو سجا کر پیش کرنے کا سلیقہ عطا کیا جاتا ہے۔ تصورات و احساسات کی نازکی میں آمد والہام کے ذریعے امداد فراہم کی جاتی ہے جس کے ذریعے غلام محمد قاصر جیسے عبقری شاعر بہ آسانی اپنے دل کا مدعا، ذہن رسا میں آنے والے خیالات، دل و دماغ میں سمانے والے تخیلات، آنکھوں دیکھے مشاہدات، زندگی میں پیش آنے والے تلخ و شیریں تجربات اور نازک احساسات و محسوسات کے ساتھ ساتھ جذبات (نفرت، غصہ، احساس، پیار، لگاوٹ، جنسی میلان، طبیعت کا رجحان)، کے جس پہلو کو چاہیں من و عن بیان یعنی منظوم کر سکنے کی قدرت رکھتے تھے۔ غلام محمد قاصر نے اپنے تمام مجموعہ ہائے کلام کو مذکورہ بالا عوامل و عناصر کے سبب تخلیق کیا ہے۔اُن کا ذہن محفل میں ہو یا تنہائی میں، ہر وقت شاعری کی بُنت میں مصروف کار رہتا تھا۔

شعر اک مشغلہ تھا قاصر کا
اب یہی مقصد حیات بنا (۲)

غلام محمد قاصر جیسا شاعر چاہے تو اپنی شاعری کے ذریعے ایک تحریک چلا سکتا ہے، کسی تحریک کو اشعار کے ذریعے مہمیز کر کے کام یاب کرا سکتا ہے۔ کسی بھی مقصد کو اپنے کلام کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ خواب غفلت میں سوئے ہوئے۔ غافل انسانوں کو بیدار کر سکتا ہے۔ تعریف سے دل جیت سکتا ہے اور چاہے تو ہجو سے اپنی نفرت و حقارت کا اظہار منظوم پیرائے میں کر کے کسی کے خلاف نفرت پیدا کر سکتا ہے اور اپنے مدعا و مقصد اور مرضی و منشا کا ابلاغ بہ آسانی عوام و خواص کے لب و زبان پر جاری کر سکتا ہے۔ ایسے شاعر کی شاعری زبان زد عام اور ضرب المثل ہونے ہونے کی مکمل صلاحیت سے بہرہ مند ہوتی ہے۔ غلام محمد قاصر اپنے اُن ہم عصر و ہم عمر شعرا میں بہ اعتبار فکر و خیال، زبان و بیان، اسلوب اور شاعرانہ ہنر مندی سے آگے ہیں جو شاعری کی معتبر و ثقہ آوازوں میں شمار ہوتے ہیں۔ عصر حاضر کے کسی بھی معتبر شاعر کا نام لیا جائے، وہ غلام محمد قاصر کے ہم پلہ تو ہو سکتا ہے اُن سے آگے نہیں۔

غلام محمد قاصر کے کلام کا انتقادی مطالعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ بیسویں صدی کے نمائندہ شاعر تھے۔ یقیناً جب بیس ویں صدی کے نمائندہ شعرا کی بات ہو گی تو غلام محمد قاصر کا نام ان میں سر فہرست رہے گا کیوں کہ غلام محمد قاصر کے افکار سے نئی نسل کے متعدد شعرا شعوری و لاشعوری طور پر اکتساب فیض کر رہے ہیں اور پاکستان کے متعدد کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ان کے فن و شخصیت اور شاعری پر ایم اے، ایم فل کے تحقیقی مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں اور مزید ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ جات لکھے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے شعرا انھیں پڑھ بھی رہے ہیں اور اُن سے متاثر ہوئے بغیر اُن کا گزارا بھی نہیں ہے۔ غلام محمد قاصر کے نت نئے تجربات شاعری، جسم شاعری میں

ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناقدین فن شاعری نے اُن کی فکری جہت، اُن کے شعری رموز و نکات کی روشنی میں متعین کی ہے۔

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھس گئے آخر کنکر جو نوکیلے تھے (۳)

غلام محمد قاصر نے اپنی راہ خود بنائی ہے۔ وہ کسی کی روش پر نہیں چلے۔ اُنھوں نے اپنے مزاج سے ہم آہنگ شاعری کی راہ متعین کی ہے۔ اُنھوں نے اس تناظر میں آج تک جس قدر سرمایہ سخن جمع کیا ہے وہ اُردو ادب عالیہ میں ایک وقیع اضافہ ہے اور اُس سے اُردو ادب کا دامن مالا مال ہوا ہے۔ کسی بھی زبان کے شاعر کو اُس کی شاعری کی بعض خوبیاں اور تازہ کاری بڑا بناتی ہیں اور اس کی شاعری کو آفاقی قرار دیتی ہیں۔ اگر ہم اُردو زبان کے شعرا کو پھولوں سے تشبیہ دیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر پھول اپنا رنگ، خوش بو اور ساخت جدا رکھتا ہے۔ ہر پھول کی اہمیت اور افادیت مختلف ہوتی ہے، مگر گلستانِ شاعری میں غلام محمد قاصر کی حیثیت تمام پھولوں میں گلاب کی سی ہے جو سیر چمن کو آنے والی مخلوق کی توجہ کا مرکز اور محبت کا محور ہوتا ہے۔ گلاب پھولوں کا بادشاہ ہے اور اپنے رنگ، بناوٹ، ساخت، خوشبو اور تراش خراش کی بنا پر دیگر تمام پھولوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ گلزار سخن میں غلام محمد قاصر کی مثال ایسی ہی ہے۔ غلام محمد قاصر نے اپنی شعری صورت گری کا سفر بعض روایتوں اور جدید و نیم جدید کے تحت جاری رکھا ہوا تھا۔ وہ ہمہ وقت اپنے شعری ادب کو تازہ کاری، ندرت خیالی اور جدت طرازی سے سجانے میں مصروف رہتے تھے۔ اس ادا نے اُنھیں اُردو ادب کا نمائندہ شاعر بنا دیا ہے۔ غلام محمد قاصر ایک بیدار مغز شاعر تھے جن کا ذہن ہر وقت شعر و سخن میں مصروف عمل رہتا ہو گا۔ اُن کی غزلیں خوب صورت افکار و اسلوب کے زیور سے آراستہ ہیں۔ وہ سچائی کے صورت گر ہیں اور ہمیشہ دیانت داری سے تخلیق شعر کرتے ہوں

گے کیوں کہ اُن کی تخلیقات میں حیات و کائنات کی حقیقتیں اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ اُن کے اشعار میں زندگی متحرک دکھائی دیتی ہے۔ کردار سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ حرکی انسان ہیں اس لیے اُن کی شاعری بھی متحرک ہے اور اُس میں مکمل طور پر حرکی توانائی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں اُن کے اشعار سفر کرتے ہیں۔ اُن کے بعض اشعار تو ضرب المثال کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا(۴)

غلام محمد قاصر اس سبب سے آزاد خیال تھے کہ وہ نظریات کے حصار میں قید نہیں، اُن کے یہاں جمود نہیں ہے نہ وہ لکیر کے فقیر ہیں۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں ۸۰ فی صد نیا ہے۔ اسی وجہ سے اُن کی شاعری میں ہر قسم کے قاری کی پسند شامل ہے اور قارئین کے منہ سے جو واہ نکلتی ہے اُس کی گونج دُور تک سنائی دیتی ہے۔ غلام محمد قاصر کی شاعری زندہ افکار سے مزین ہے۔

غلام محمد قاصر کی زیر کی دیکھیے کہ انھوں نے جدید غزل کے امکانات کو پہلے سمجھا اور پھر اپنی غزل میں برتا۔ اُن کی غزلیات سے اُن کا ادراک اور فہم جھلکتا نظر آتا ہے۔ غزل کے لیے جو امکانات اور رنگ و آہنگ درکار ہوتے ہیں غلام محمد قاصر کی اُن پر خصوصی توجہ تھی۔ اُن کی غزلوں کے اشعار انسانی زندگی اور اُس کی سچائیوں سے گندھے ہیں۔ اُن کی غزلیات انسان اور انسانی کیفیات و کردار کی خوش نما تصویریں بھی پیش کرتی ہیں۔ یہ غزلیں ہی غلام محمد قاصر کو دور جدید کی غزل کا زیرک اور مزاج شناس ثابت کرتی ہیں۔ اس لیے اُن کا کلام موجودہ دور کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ اُن کی غزل لمحہ موجود کی آب و ہوا میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ جو لوازم ہمارے معاشرے کے لیے ضروری اور اہم ہیں اور جن کا تقاضا

عہد حاضر کرتا ہے اُن کی غزل اُسی ماحول اور فضا میں پنپ رہی ہے اور اپنے تروتازہ ہونے کا احساس دلا رہی ہے۔اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی قاصر کے پہلے شعری مجموعے تسلسل کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

قاصر غزل کی سی قدیم صنف میں اظہار کرتا ہے مگر اس کے موضوعات، بات کہنے کے انداز، بیسویں صدی کو اپنے جلو میں لے کر چلنے کے تیور، تشکیک وتذبذب میں معلق عصر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یقین واعتماد کے ساتھ نغمہ گری، اپنی علاقائی اور پھر وطنی خصوصیات کہ پورے کرہ ارض سے مربوط کر دینے کے حوصلے یہ سب مل کر قاصر کی منفرد پہچانیں ہیں۔۔(۵)

غلام محمد قاصر ایسے ذہین و فطین شاعر ہیں جو اپنے ارد گرد حالات اور زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا تجزیہ کر کے شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔اس لیے اُن کے اشعار میں تلخ وشیریں تجربات کی بھرمار ہے اور اُن میں اُن کے عمیق مشاہدات جا بہ جا نظر آ رہے ہوتے ہیں۔اُن کی غزلیات نازک احساسات اور شدید جذبات سے مملو ہیں۔اُن کا ہر شعر کوئی نہ کوئی مقصد لیے ہوئے ہے، وہ روایتاً یا وقت گزارنے کے لیے شعر نہیں کہتے تھے۔

کچھ سخن ور، سر دربار وہاں تک پہنچے
شعر جس موڑ پر اخبار نظر آتا ہے
ایسی آندھی ہے کہ جمنے لگی آواز پہ گرد
لفظ مفہوم سے بے زار نظر آتا ہے(٦)

اتنا ضرور ہوا ہے کہ جب غلام محمد قاصر نے رومانی غزل کہی ہے تو روایت کا سہارا لیا ہے، کیوں کہ اصل تغزل کی عمارت روایت کی بنیاد پر کھڑی ہے۔کوئی شاعر کتنے ہی نئے

اُسلوب میں رومانی خیالات وجذبات اور وارداتوں کو بیان کرے، مگر کلاسیکی اثرات کے حصار سے نہیں نکل سکتا۔اُس کا ہلکا یا گہرا اثر ضرور سامنے آتا ہے۔اس مرحلے پر بھی غلام محمد قاصر نے روایت کے ساتھ جدید انداز نگارش برتا ہے جس سے اُن کی شاعری قدیم وجدید کے امتزاج کا حسین سنگم بن گئی ہے۔

دشت میں کل قاصر کے لئے
قیس نے کرسی خالی کی (۷)

شاعری کی روح تخیل ہے اور غلام محمد قاصر کی شاعری میں تخیل کی پرواز اس قدر بلند ہے کہ آسمان سخن کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔شاعری وجدانی اور ذوقی کیفیت کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ تخیل کے حقیقی معانی ہی کسی خیال کو الفاظ کا لباس زیب تن کراتا ہے۔ تخیل کو مجسم اور الفاظ کا پیکر عطا کر دیناہی اصل شاعری ہے جو شاعر اپنے تخیل کو تخئیل میں ڈھال دیتا ہے وہ بڑا کمال شاعر کہلاتا ہے۔غلام محمد قاصر نے اپنے تخیلات، تصورات اور خوابوں تک کو شاعری میں منتقل کر دیا ہے۔یہ ہنر بہت کم شعرا کو آتا ہے جس طرح مصور تو بے شمار گزرے ہیں سبھی نے اپنے اپنے فن کے مطابق خیالات کو صفحہ قرطاس پر پینٹ کر کے تصویر کشی کی ہے، مگر جو تصویر کشی مانی و بہزاد نے کی ہے اُس کی مثال آج تک نہ لائی جاسکی۔اسی طرح ہزاروں شاعر، شاعری تو کر رہے ہیں وہ سب عام مصوروں کی طرح تصویر کشی کر رہے ہیں، مگر غلام محمد قاصر مانی و بہزاد کی طرح اپنے خیالات کو الفاظ کے پیکر میں مجسم انداز دے کر پیش کر دیا ہے جو دل کش بھی ہیں اور قابل دید بھی۔اُن کا پیکر دیدہ زیب بھی ہے اور متاثر کن بھی۔اس لیے جو شخص غلام محمد قاصر کے الفاظ کی تصویری دیکھتا ہے وہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور اُن کی پیش کش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔اُن کی غزلیات کے

پیکر اس قدر خوبصورت اور حسین و جمیل ہیں کہ جمالیات کے رسیا ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

یہ جہاں نورد کی داستاں یہ فسانہ ڈولتے سائے کا
میرے سر بریدہ خیال ہیں کہ دھواں ہے سونی سرائے کا
وہ ہوا کا چپکے سے جھانکنا کسی بھولے بسرے مدار سے
کہیں گھر میں شہر کی ظلمتیں کہیں چھت پہ چاند کرائے کا(۸)

ایک غزال کو دور سے دیکھا اور غزل تیار ہوئی
سہمے سہمے سے لفظوں میں ہلکی سی کستوری تھی(۹)

غلام محمد قاصر کی شاعری کا بڑا حصہ موضوعاتی شاعری پر مشتمل ہے، اس لیے اُنھیں محاکات سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ واقعہ نگاری میں محاکاتی عمل کسی نہ کسی صورت میں شامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیرک اور طباع شاعر متخیلہ سے اکثر کام لیتے ہیں۔ معمولی سے معمولی بات کو بھی اپنے تخیل سے ارفع و اعلیٰ بنا دیتے ہیں۔ شاعر موصوف اپنی شاعری میں محاکات سے اس طرح شعریت پیدا کر دیتے تھے کہ وہ تخیل کی مدد سے اس میں حیرت کو سمو دیتے تھے۔

یونہی آساں نہیں ہے نور میں تحلیل ہو جانا
وہ ساتوں رنگ قاصر ایک پیراہن میں رکھتا ہے(۱۰)

اس لیے اُن کی شاعری کا بڑا حصہ اچھی اور سریع التاثیر شاعری پر مشتمل ہے، لہذا غلام محمد قاصر کو اُردو کا طباع اور بڑا شاعر ہونے کا تاج پہنایا جا سکتا ہے کیوں کہ غلام محمد قاصر

نے اپنے تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، نازک احساسات اور شدید جذبات کی روشنی میں غزل کو نئے موضوعات اور اسلوب کا چہرہ عطا کیا ہے۔ وہ غزل کو ارتقا کے مراحل سے گزار کر ایک ایسے موڑ پر لے آئے ہیں جہاں اُنھوں نے اپنے سفر شاعری کو ایک نئی ڈگر عطا کی ہے جو سیدھی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ اُن کی شاعری فکری اور فنی خوبیوں کا اجتماع ہے۔ غلام محمد قاصر ایک صاحب طرز شاعر ہیں کیوں کہ اُنھوں نے بہ طور خاص اُردو غزل میں نئے رنگ و آہنگ اور اُسلوب کا اختصاص حاصل کر لیا ہے کیوں کہ پہلے غلام محمد قاصر نے اپنے اسلاف کو خوب پڑھا، اپنے ہم عصر شعرا کا مطالعہ کیا، تب کہیں جا کر اُنھوں نے اپنے مزاج شاعری کو الگ جہت پر ڈالا اور آخر تک اپنی مخصوص روش پر قائم رہے جس نے اُنھیں صاحب اسلوب شاعر بنا دیا ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر معین الدین عقیل تحریر کرتے ہیں:

متنوع صفات اور خصوصیات اور خیال و فکر کی گہرائی و ندرت قاصر صاحب کے کلام میں ایک انفرادیت لیے ہوئے اس طرح اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے کہ بہت کم معاصر شاعروں میں اس طرح دیکھی جا سکتی ہے ان صفات و خصوصیات کے ساتھ ساتھ جو ندرت خیال اور جدت فکر قاصر صاحب کے کلام میں نمایاں ہے وہ انہیں معاصر شاعروں سے مختلف و منفرد ٹھہراتی ہے (۱۱)

غلام محمد قاصر اپنے کلام کی روشنی میں عہد حاضر کے ایک کام یاب و معتبر اور ثقہ شاعر ہیں۔ شاعری میں اُن کا تجربہ ۴۰ برس کا ہے۔ یہ عرصہ معمولی نہیں۔ ایک نسل پروان چڑھ کر جوان ہو جاتی ہے۔ غلام محمد قاصر نے جس طرح زندگی کو بسر کیا ہے اُس کی وجہ سے وہ اپنی تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر وسیع المطالعہ بھی ہیں اور وسیع المشاہدہ بھی۔ وسیع مطالعہ کی بنیاد پر اُن میں جو تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت ہے وہ انسان کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کرتی

ہے کیوں کہ اُن کا مطالعہ اور مشاہدہ معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی ہے۔ غلام محمد قاصر کی طبیعت میں موزونیت تھی اور انھیں علم عروض از بر تھا۔اُن کے تمام کلام کو بہ غور دیکھ لیں، اُن کا کوئی ایک مصرع بھی بے وزن یا خارج از بحر نہیں ہے۔ یہ مہارت بہت کم ایسے شعرا میں ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے شاعری کی دولت دویعت کی ہے۔ غلام محمد قاصر کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کو قدرت نے پیدائشی طور پر فن شاعری کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ وہ مردہ جذبات واحساسات اور مشاہدات کی شاعری نہیں کرتے ،اُن کی شاعری میں کافور کفن کی خوش بو نہیں ،اُن کی شاعری حیات و کائنات کے فلسفے کے گرد گھومتی ہے۔ انسان اور اُس کے افعال واعمال بیان کرتی ہے۔اُس کی زندگی کی تشریحات و تفسیر میں غلام محمد قاصر کی شاعری ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا موضوع انسان ہے۔ غلام محمد قاصر کی شاعری کا مرکز و محور بھی انسان ہے، لہذا اُنھوں نے بڑے موضوعات پر بڑی شاعری کی ہے۔ وہ انسانی اخلاق و کردار کے ماہر صورت گر ہیں۔

اشکوں سے بن کے مرثیہ پہنا دیا گیا
اب زندگی کے تن پہ غزل کا لباس ہو
اجلا رہے گا صرف محبت کے جسم پر
صدیوں کا پیراہن ہو کہ پل کا لباس ہو (۱۲)

غلام محمد قاصر کے سرمایہ سخن سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ وہ تجربات کرنے والے شاعر ہیں۔اُنھوں نے شاعری میں متعدد تجربات کیے ہیں اور اُن تجربات سے جو کچھ نئے نتائج بر آمد ہوئے ہیں وہ اُنھوں نے قارئینِ شعر و سخن، ناقدین فن اور مشاہیر اردو ادب کے سامنے من و عن پیش کر دیے ہیں۔ان تجربات اور اُن کے نتائج کی روشنی میں شاعری کو نئے سفر سے متعارف کرایا اور جدید موڑ دیا جا سکتا ہے۔ نئے مراحل سے گزارا جا سکتا ہے تا

کہ شاعری پر جمود طاری نہ ہو، وہ متحرک رہے اور اپنے ساتھ نئے زمانے، نئے دور اور اُس کے تقاضوں کو بھی لے کر چلے۔ اس میں اُردو شاعری کی بقاو سلامتی ہے اور اسی میں اُس کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ آج جو اُردو شاعری ایک نکھرے ہوئے پیکر میں ہم تک پہنچی ہے یہ سب ہمارے اسلاف شعرا کی محنت شاقہ، عرق ریزی اور باریک بینی کا ثمرہ ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف زبان و بیان پر توجہ دی بلکہ حرف، لفظ، جملے، تراکیب اور محاورات تک کو سنوار کر شاعری کا حصہ بنایا۔ غلام محمد قاصر نے بھی اپنے علم، دانش تعلیمی قابلیت، ذہنی صلاحیت اور فن شاعری کی بنیاد پر نہ صرف اُردو زبان کے گیسو اپنے شانہ تدبیر سے سنوارے ہیں بلکہ اُردو شاعری کو بھی ایک نئے رنگ و آہنگ سے مزین کیا ہے۔ ایک نیا پیراہن فکر و خیال بخشا ہے۔

جنوں کا جام محبت کی مے خرد کا خمار
ہمیں تھے وہ جو یہ سارے کمال رکھتے تھے (۱۳)

حوالہ جات

1۔ غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، رنگ ادب پبلیکیشنز، کراچی، اپریل 2018، صفحہ 98
2۔ ایضا صفحہ نمبر 56
3۔ ایضا، صفحہ نمبر 41
4۔ ایضا، صفحہ نمبر 452
5۔ احمد ندیم قاسمی، تسلسل کا شاعر مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر اپریل تا جون 2022، رنگ ادب پبلیکیشنز، کراچی، 2022، صفحہ نمبر 193
6۔ غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، رنگ ادب پبلیکیشنز، کراچی، اپریل 2018، صفحہ 318
7۔ ایضا، صفحہ نمبر 481
8۔ ایضا صفحہ نمبر 315
9۔ ایضا صفحہ نمبر 305
10۔ ایضا صفحہ نمبر 52

11۔ڈاکٹر معین الدین عقیل، عشق کے اک عنواں کی کتاب!، رنگ ادب گلام محمد قاصر نمبر اپریل تا جون 2022، رنگ ادب پبلیکیشنز، کراچی، 2022، صفحہ 216
12۔ غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اپریل 2018، صفحہ نمبر 363
13۔ایضا، صفح 43

سمیہ زیب
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، جامعہ ہزارہ، مانسہرہ (پاکستان

غلام محمد قاصر کی شاعری میں محبت کا کردار

ملخص:

(محبت اردو شاعری کی روایت میں ایک اہم بنیادی موضوع رہا ہے، تمام شعرا نے اسے اپنے منفرد اسلوب اور نظام فکر کے تحت موضوع سخن بنایا۔ غلام محمد قاصر کی شاعری میں محبت محض ایک سطحی جذبہ، روایتی داستاں یا عاشقانہ تحیر تک محدود نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر، وجودی اور آفاقی حقیقت ہے۔ قاصر کے ہاں محبت خالق و مخلوق سے عقیدت، وطن سے محبت، اور جنگ و تشدد کے خلاف امن وانسانیت کے فروغ کا بنیادی وسیلہ بن کر ابھرتی ہے۔ ان کا انداز روایتی شکوے اور جنون کی بجائے معصومیت، شائستگی، سادگی اور بظاہر شرمیلے پن پر مبنی ہے۔

اس کے علاوہ قاصر کی شاعری میں محبت کا ایک نادر رخ مابعد النفسیاتی اور ماورائی ابعاد سے جڑا ہوا ہے، جہاں محبت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر روح کو کائناتی وسعتوں کی سیر کراتی ہے۔ قاصر نے جدید شہری زندگی کی بیگانگی اور تنہائی کا حل بھی محبت ہی کو قرار دیا اور کلاسیکی شائستگی کو جدید لسانی حسیت کے ساتھ یکجا کر کے اردو غزل میں محبت کے مضمون کو ایک نیا فکری و جمالیاتی افق عطا کیا۔)

کلیدی الفاظ:

غلام محمد قاصر، تصورِ محبت ،رومانویت اور معصومیت،مابعد النفسیات / پیراسائکالوجی، شہری بیگانگی، روایت اور جدت۔

اردو شاعری کا وہ بنیادی ستون ہے جس کے گرد صدیوں کی تخلیقی اور فکری تاریخ گردش کرتی نظر آتی ہے اردو شاعری بالخصوص غزل نے ہر دور میں تشکیل پانے والے سماجی سیاسی معاشی اور فکری اثرات کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے محبت کے موضوع کو ندرت اور جدت سے روشناس کرایا اسے غیر معمولی فکری گہرائی اور معنوی گیرائی سے لبریز کیا،اردو شاعری کی روایت میں متحدہ ہندوستان کا مخصوص سماجی پس منظر ایک مستقل کردار کی صورت میں عہد بہ عہد شامل رہا ہے جاگیر دارانہ نظام تہذیب و روایت کی دیواریں اخلاقی قدغن اور ان کے اثرات سے نمو پاتے گھٹن زدہ معاشرے میں محبت کا ذکر ایک تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتا ،اس جبری نظام کی دین تھی کہ محبت ہمیشہ ایک المیہ کی شکل میں ابھرتی جہاں ہر محبت کرنے والا ناکامی کی تیغ ستم شعار کا شکار ستم زدہ اور بے بس دکھائی دیتا۔

وقت نے کروٹ بدلی اور اردو شاعری کو دکن کی سرزمین سے ولی جیسا عظیم شاعر عطا ہوا،ولی دکنی نے اپنی شاعری میں رنج و ملال اور گریہ زاری کی بجائے شگفتگی قبولیت اور رجائیت کا پیغام سنایا۔نت نئے استعاروں سے محبت کے موضوع میں ندرت کے رنگ بھرے،ولی کی شاعری کے کینوس پر محبت کی تصویر تقدس شوخی و وارفتگی کے رنگوں سے تشکیل پاتی ہے محبوب کے کوچے ، مقدس قریے ہیں،اس کی زلفیں موجدار دریا ہیں، تھوڑی کا تل جھیل کنارے بیٹھا جوگی ہے۔ولی کے استعاروں نے شاعری اور محبت کو مقامی اور زمینی رنگ عطا کیا۔

کلاسیکی اردو غزل کے دو بڑے ستون میر اور غالب نے محبت کو کائنات کی بنیاد اور زندگی کا بنیادی محرک قرار دیا، میر کے نزدیک عشق و محبت اک مقدس آگ ہے جو روح کو جلا بخشتی ہے۔ جبکہ غالب کے نزدیک عشق کی آگ بظاہر انسان کے قابو سے باہر نظر آتی ہے حقیقت میں وہ اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اسے اپنے بس میں رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں غالب کے نزدیک محبت زندگی اور موت کے فرق کو مٹا دیتی ہے غالب کا تصور محبت مادی اور وجودی ہے جہاں وصل کی خوشی اور ہجر کا دکھ دونوں ایک متوازن فکری فریم ورک کے تحت قابو میں رہتے ہیں۔

اردو شاعری کی روایت میں محبت کا مضمون بنیادی طور پر تین کرداروں اور جذباتی حالتوں کے گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ ہجر، وصال اور رقیب۔۔ یہ مثلث شاعری کی روایت میں ہمیشہ موجود رہی ہے کہیں رنگ جمانے کو حضرت ناصح بھی دکھائی دیتے ہیں۔ محبوب ناقابل رسائی ہے مگر محبوب کا کردار جامد نہیں بلکہ سماجی اور معاشی تبدیلی اس کردار کی ہیئت میں بھی تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔

ترقی پسند تحریک اس محبت کو تخیلات کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی سنگلاخ وادیوں میں لے آتی ہے، یہاں محبت ذات سے نکل کر کائنات کی وسعتوں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے ۔اب محبت محض ہجر اور وصال کا عنوان نہیں یہ ایک فرد کی وجود میں مجسم نہیں۔اب نئے استعارے جنم لیتے ہیں، عاشق کے لیے عشق اور کام دونوں ہی ناگزیر ہیں کام عشق کے آڑے آتا ہے اور عشق سے کام الجھتا ہے۔۔ محبوبہ ایک عشوہ طراز حسینہ نہیں رہی بلکہ آزادی کا تصور، معاشی خوشحالی کی امید اور انقلاب کی خواہش بھی محبوب کے حسین چہرے کی طرح عزیز جان ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو شاعری میں جہاں ہیئت اسلوب اور فن کے حوالے سے نت نئے تجربات ہوئے وہیں محبت بھی نئے روپ اور نئی علامتوں کے ساتھ شاعری میں جگہ پاتی ہے۔ فیض کے ہاں انقلاب کی خواہش ہے تو فراز کے ہاں زندگی کی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی قوت۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اردو شاعری میں بہت توانا اور منفرد آوازیں ابھرتی دکھائی دیتی ہیں ستر کی دہائی اردو شاعری کا وہ زرین دور ہے جس میں متعدد شعرائے کرام منظر عام پر آتے ہیں۔ اس دور کے شعرائے کرام محض شعر و سخن کی بساط بچھا کر لفظ و معنی کی چال نہیں چلتے بلکہ ان کے ہاں فکری گہرائی معنوی گیرائی اور وسعت افکار کے انوکھے رنگ نظر آتے ہیں۔ جدید اردو غزل کی تاریخ میں غلام محمد قاصر ایک ایسے صاحب اسلوب شاعر کے طور پر ابھرتے ہیں جنہوں نے کلاسیکی شعر گوئی کے روایتی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید حسیت ندرت خیال اور جدید لسانی جمالیات سے مالا مال کیا۔

معاصر شعری منظر نامے میں قاصر کا مقام اس لحاظ سے انتہائی منفرد ہے کہ انہوں نے اپنے دور کی مروجہ ادبی تحاریک کی اندھی تقلید نہیں کی، بھیڑ چال چلتے ہجوم کا حصہ نہیں بنے اندھی عقیدت اور بے شعوری کی روش سے دامن بچاتے ہوئے انسانی نفسیات کی اتھاہ گہرائیوں وجودی حقیقتوں اور معاشرتی المیوں کو اپنی غزل کا موضوع بنایا قاصر کی شعری کائنات کی بنیادی فکر، مرکز اور محرک محبت کا جذبہ ہے تاہم ان کی شاعری میں محبت محض روایتی رومانی داستان، محبوب کے لب و رخسار، زلف و ابرو کی تعریف یا سطحی جذباتیت تک محدود نہیں بلکہ یہ شش جہات پر محیط ایسا وجودی تجربہ ہے جو انسان کی باطنی دنیا سے لے کر اجتماعی سماجی اقدار اور کائنات کا احاطہ کرتا ہے۔

بقول ہما بیگ:

عشق و محبت کی کیفیات کو اپ نے اپنی شاعری میں ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ جگہ دی ہے لفظی اور معنوی ہر دو سطحوں پر شاعری کے نئے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔(۱)

غلام محمد قاصر کی شاعری میں محبت ایک ایسی شفا بخش قوت بن کر سامنے آتی ہے جو انسانی وجود کو ناہمواری اور نامسائد حالات، شہری بیگانگی اور نفسیاتی انتشار کے درمیان جینے کا سہارا دیتی ہے۔

ایک خوشبو رواں سارے خوابوں میں ہے
روشنی سی گلابوں میں ہے
جگمگاتی رہیں رات کی رانیاں اور مہکتے رہیں موتیے (۲)

قاصر کو محبت کا شاعر کہنا بے جا نہیں ہے ان کے ہاں محبت کی آفاقیت کے رنگ ایک وجود سے، ایک ذات سے نکل کر کل کائنات کے کینوس پر بکھرے دکھائی دیتے ہیں ان کی محبت کا خمیر حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حب اہل بیت علیہم السلام سے اٹھتا ہے اور انسان دوستی کے آفاقی پیغام کے ساتھ دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔اس کا کینوس انتہائی وسیع ہے ان کے ہاں محبت زندگی کی بنیادی اور تحریکی روح ہے جو خالق، مخلوق، وطن اور فکر کے تمام رشتوں کو جوڑتی ہے۔

قاصر کی ایک حمدکا یہ شعر اس کی خوب عکاسی کرتا ہے:

آزمائش میں کوئی تجھ کو صدا دیتا ہے
اور تو آگ کو گلزار بنا دیتا ہے(۳)

غلام محمد قاصر کی شاعری میں محبت کا پہلا اور سب سے معتبر روپ روحانی عقیدت کی شکل میں نظر آتا ہے۔ حمد، نعت، سلام و منقبت میں ان کا قلم عجز و نیاز اور پاکیزہ جذبات سے لبریز نظر آتا ہے، ان کی حمد کے یہ اشعار اس کی بخوبی عکاسی کرتے ہیں:

جو ہواؤں میں تیرے نام کو قندیل کرے
روشنی اس کے لیے راستہ تبدیل کرے
تیرے پیغام محبت سے الگ کچھ بھی نہیں
صبح نو کی یہ جہاں کوئی بھی تاویل کرے(۴)

غلام محمد قاصر کی تقدیسی ورثائی شاعری کی بنت محض الفاظ و تراکیب کی ترتیب سے نہیں، اس کے تار و پود میں جذبات و محسوسات کی سچائی گندھی ہے۔ اہل بیت اطہار اور شہدائے کربلا سے ان کی محبت تاریخی اور اساطیری استعاروں کو نیا فکری رنگ دیتی ہے انہوں نے حق و باطل کے معرکے کو جابرانہ اقتدار اور محبت کی ابدی فتح کے درمیان تصادم کے طور پر پیش کیا جہاں امام حسین علیہ السلام کا کردار محبت کی عالمگیر اخلاقی قوت کے طور پر ابھرتا ہے:

روشنی تیرے سفینے میں سمٹ جاتی ہے
جب بھی گھبراتی ہے ظلمت کی طغیانی سے
کربلا عشق کا معیار بھی دشوار بھی ہے
آگے جنت ہے جو مل جاتی ہے آسانی سے(۵)

قاصر کی محبت کے کینوس پر محض تقدیس و تحلیل کے رنگوں کی گلکاری نہیں بلکہ ان کی محبت ہفت رنگ ہے ،اس قوس قزح میں قوم و ملت اور وطن سے محبت کے دلکش رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں ملی قومی اور ادبی شخصیات سے محبت کا گہرا احساس بھی نظر آتا ہے قائداعظم محمد علی جناح کے حوالے سے ان کی ایک نظم کے اشعار ہیں:

عزت نفس کا پیمانہ خم آزادی
تو نے سب سے میرا حصہ مجھے دلوایا تھا
میں نے پوچھا تھا کہ اخلاص کسے کہتے ہیں
ایک بچہ تیری تصویر اٹھالایا تھا(٦)

اپنی سرزمین سے محبت کا اظہار نظم،وطن کے لیے میں ان الفاظ میں کرتے دکھائی دیتے ہیں:

فن کی حیرت سرا میں آویزاں
تو مصور کا آخری شاہکار
تیرے پرتو سے مہر و ماہ بنے
جن کا ذروں میں بھی نہیں تھا شمار
تیری چاہت نے لازوال کیا
زندگی ورنہ ریت کی دیوار(٧)

قاصر کی محبت کا ایک اور رنگ ان کا جذبہ امن ہے، قاصر حساس اور انسان دوست شاعر ہیں،جو ہر قسم کے تشدد جنگ اور سفاکی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں کشمیر کے جلتے چنار ہوں، بوسنیا اور فلسطین کے مظلوم ہوں بیروت کے حالات ہوں یا پشاور گڑھی قمر دین کے سکول میں ہونے والا بم دھماکہ ، قاصر کی شاعری میں انسانیت کی محبت تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کی عالمگیر محبت کا یہ رنگ ایک ایسے مطلع میں ڈھلتا ہے جس میں بلا تفریق رنگ

نسل اور مذہب کل نوع انسانی کے لیے ایک پر امن، روشن اور حسین دنیا کی تعمیر کا خواب جگمگاتا ہے:

بارود کے بدلے ہاتھوں میں آجائے کتاب تو اچھا ہو
اے کاش ہماری آنکھوں کا اکیسواں خواب تو اچھا ہو (۸)

یہ شعر محض ایک تخلیقی خواہش نہیں بلکہ قاصر کے اس بنیادی نظریے کا ترجمان ہے کہ محبت ہی وہ قوت جذب وارتقا ہے جو انسانی قدروں کے فروغ کی ضامن ہے۔

قاصر کی غزل کا حسین ترین پہلو ان کا دل فریب رومانوی لہجہ اور اس میں موجود معصومانہ سچائی ہے۔ محبت کے اس فطری بہاؤ کے عکاس ان کے اشعار اس قدر رواں بر محل اور موزوں ہیں جن میں کوئی بھی فنی سقم ہے نہ فکری ارزانی بلکہ فکری اپج میں وہ اپنے متعدد ہم عصر شعرا سے آگے دکھائی دیتے ہیں، قاصر کے اس بے مثال اسلوب اور لہجے کے متعلق صوفی تبسم فرماتے ہیں:

"ان کے شعر پڑھ کر ایک ہاتھ سے سر کو کھجانا اور دوسرے ہاتھ سے قلب کو سنبھالنا پڑتا ہے قاصر کا اسلوب بیاں میر کی سادہ بیانی غالب کی تخیل آفرینی اور اقبال کی وسیع النظری کے افق سے سر شار ہو کر ابھرتا دکھائی دیتا ہے" (۹)

جدید غزل کے امکانات کی بات کی جائے تو غزل اپنے مخصوص دائرے سے نکل کر وسعت اختیار کر چکی ہے گل وبلبل، شمع وپروانہ، محبوب کی زلف کے خم سے چاہ زقن تک تمام موضوعات نئے مفاہیم کے ساتھ غزل میں آشکار ہوئے ہیں۔ اس بدلتے وقت میں وہی فنکار اپنا مقام بنا سکتا ہے جو غزل کی روایت میں جدت کی تازہ کاری کا حوصلہ رکھتا ہو ندرت خیال شاعر کا وصف ہے روایت کے دامن سے وابستہ رہتے ہوئے اسے منفرد آہنگ عطا کرنا اس کا کمال یہ کمال غلام محمد قاصر کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔

قاصر کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے شعر کو بطور مشغلہ اپنایا اور پھر مقصد حیات بنالیا وہ خود فرماتے ہیں:

شعر ایک مشغلہ تھا قاصر کا
اب یہی مقصد حیات بنا(۱۰)

مشغلے سے مقصد حیات تک کے سفر میں جو چیز قاصر صاحب کے ساتھ ساتھ رہتی ہے وہ ان کی طبعی بے نیازی اور بے کراں محبت ہے ان کی شخصیت کا یہ دلکش عکس ان کی شاعری میں جابجا دکھائی دیتا ہے قاصر کی شخصیت کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ لفظ محبت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا محبت جو الوہی وصف ہے اور ہر انسان کی ضرورت ہے اسی کے سبب نظام کائنات رواں دواں ہیں محبت کا جذبہ انسانی دل سے ابھرتا ہے اور کائنات کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔

غلام محمد قاصر کی شاعری میں محبت محض ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک ایسی کائناتی سچائی ہے جس کی عمارت نہ صرف ان کی ذات بلکہ اقلیم فن کی بنیاد پر استوار ہے۔

غلام محمد قاصر کی پہچان ان کا زبان زد عام شعر:

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا(۱۱)

محبت کا یہ دائرہ جس کا مرکز انسان کی ذات ہے قاصر اس دائرے کا آغاز اپنی ذات سے کرتے ہیں، حب رسول، حب اہل بیت سے گزر کر محبت کا یہ حلقہ تمام انسانیت تک پھیل جاتا ہے۔ محبت کے خارزار میں قاصر کا شوق انہیں برہنہ پا لیے چلتا ہے تسلسل کی پہلی غزل کے مطلع:

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھس گئے آخر کنکر جو نوکیلے تھے (۱۲)

اس شعر سے شروع ہونے والے سفر میں قاصر قارئین کو محبت کے کئی رنگوں سے آشنا کرتے ہیں۔ وہ شہر محبت کے باسیوں کے لیے محبت کے امکانات کے نئے در وا کرتے ہوئے فرماتے ہیں؛

کل زمانہ جان لے گا اس کے باشندوں کے پیشے
آج تو شہر محبت کی فقط آب و ہوا لکھ (۱۳)

قاصر جیسے محبت کے پیکر کے لیے محبت کا سفر ایک جست ہے جس کی طوالت یا اختصار جذبے کی شدت پر منحصر ہے. فرماتے ہیں

محبت اے محبت ایک جذبے کی مسافت ہے
میرے آوارہ سجدے سے تیری چوکھٹ کے پتھر تک (۱۴)

محبت کا جذبہ قاصر کے ہاں لافانی ہے فرماتے ہیں:

پیار کے عکس لازوال ہوئے
ورنہ جو آئینہ ہے فانی ہے (۱۵)

محبت کا عکس قاصر کے ہاں لازوال ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جہاں تنہائی بھی تنہا نہیں رہتی:

اکیلا دن ہے کوئی اور نہ تنہا رات ہوتی ہے
میں جس پل سے گزرتا ہوں محبت ساتھ ہوتی ہے (۱۶)

قاصر کی شاعری میں محبت امید ہے رجائیت کا پیغام ہے، مستقبل کی آس ہے اور لمحہ موجود کے بقا کی ضامن ہے۔ یہ محبت کا اعجاز ہے کہ ڈیرہ اسماعیل خان کا یہ درویش صفت شاعر، شہرت اور ناموری سے بے نیاز دلوں کو تسخیر کرتا جس پل سے گزرا محبت ساتھ رہی۔

قاصر کی شاعری میں بھڑک نہیں ہے وہ جذبات کا بھانبڑ جلا کر لمحہ بھر میں خاکستر نہیں کرتے، دھیمی آنچ پہ جذبوں کو احساسات اور تخیل کے سانچے سے گزارتے ہیں اور کومل سروں میں محبت کے گیت الاپتے ہیں ان کے ہاں محبت وہ کائناتی سچائی ہے کہ جس کی عدم موجودگی کائنات کے رنگوں کو تحلیل کر سکتی ہے فنا کر سکتی ہے۔ وہ بقا کا راز محبت میں تلاش کرتے ہیں اسی لیے کہتے ہیں کہ:

اجلا رہے گا صرف محبت کے جسم پر
صدیوں کا پیرہن ہو کہ پل کا لباس ہو (۱۷)

غلام محمد قاصر کی شاعری قاری کو صرف مسحور نہیں کرتی، ہاتھ تھام کر ان کیفیات کے بام عروج تک لے جاتی ہے جو دل میں زیر آب لہروں کی مانند ہلکورے لے رہے ہوں، ان کی شاعری میں محبت کی انوکھی رمزیں پوشیدہ ہیں جو بے چین نہیں کرتیں، نرمی سے دل پہ ہاتھ رکھتی ہیں کسی ماں کی ممتا بھری شیریں آواز میں تھپک تھپک کر درد اور بے چینی کو ختم کرتی ہیں۔ اضطراب کی بجائے ہلکے اور سرور آمیز دکھ سے ملاتی ہیں طمانیت بھرا دکھ جو انسانیت کا وصف ہے جو انسان دوستی کی پہچان ہے۔ اس درد دل کی دولت ہی کی عطا سے قلم کار اور فنکار ذات کی حدود سے نکل کر کائینات کی وسعتیں تسخیر کرتا ہے۔

غلام محمد قاصر نے روایت کے پرانے استعاروں کو برتنے کی بجائے محبت کے اظہار کے لئے نئے نویلے استعارے اور علامتیں گھڑیں، محبت میں قربت کا احساس ان کے ہاں حواس کو موہ لینے والی معطر حقیقت بن جاتا ہے:

گلابوں کی نشیمن سے میرے محبوب کے سر تک
سفر لمبا تھا خوشبو کا مگر آ ہی گئی گھر تک (۱۸)

پہلے اک شخص میری ذات بنا
اور پھر پوری کائنات بنا (۱۹)

ان کے اس منفرد اسلوب پر احمد ندیم قاسمی نے بجا طور پر لکھا تھا:

جب کوئی سچ مچ کا شاعر بات کہنے کا اپنا سلیقہ روایت میں شامل کرتا ہے تو پوری روایت جگمگا اٹھتی ہے۔ (۲۰)

جدید دنیا کی زبردست ترقی کے باوجود انسان جس باطنی تنہائی بیگانگی اور نفسیاتی انتشار کا شکار ہے، غلام محمد قاصر محبت کو اس کا سب سے بڑا تلافی کنندہ قرار دیتے ہیں شہروں کا پھیلاؤ اور معدومیت کے دور میں مخلصانہ رشتوں کا فقدان انسان کو اپنوں کے درمیان بھی تنہا کر دیتا ہے۔ قاصر شہروں کی اداسی اور گھٹتے ہوئے رشتوں کو دیکھ کر کہتے ہیں:

گلیوں کی اداسی پوچھتی ہے گھر کا سناٹا کہتا ہے
اس شہر کا ہر رہنے والا کیوں دوسرے شہر میں رہتا ہے (۲۱)

اس ہمہ گیر تنہائی کے عالم میں محبت ہی وہ واحد دلاسہ ہے جو انسانی وجود کو ادھورا رہنے سے بچاتی ہے اگر گھر میں پیار و محبت کا وجود نہ ہو تو تمام مادی آسائشیں اور تعیشات بے معنی ہو جاتے ہیں اس کیفیت کو قاصر ہوں مجسم کرتے ہیں:

پیار گیا تو کیسے ملتے رنگ سے رنگ اور خواب سے خواب
ایک مکمل گھر کے اندر ہر تصویر ادھوری تھی (۲۲)

اس کے علاوہ قاصر محبت کو انسان کی بنیادی اور فطری طلب قرار دیتے ہیں۔ غلام محمد قاصر کی شاعری میں محبت کے رنگ کا فکری اور اسلوبی سطح پر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ غلام محمد قاصر کے اسلوب اور لہجے میں معصومیت، سادگی شرمیلا پن اور انسانی عجز کا باوقار اعتراف ہے۔ جبکہ کلاسیکل شاعری میں محبوب کا انداز حاکمانہ ہے اور بے چارہ عاشق شدید نالہ و فریاد تذلیل اور اور جنون کا غماز۔

قاصر کے ہاں محبت کے استعارے ماورائی مابعد النفسیاتی اور کائناتی ہیں کہیں وہ سیر سماوات کا ذکر کرتے ہیں کہیں آٹھویں آسمان کا امکان تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں ہتھیلی پر آگ کی تلاش میں نور اٹھالانے کا ذکر کرتے ہیں۔

غلام محمد قاصر کی زبان اور اسلوب میں بے شمار ایسے نئے تجربات پائے جاتے ہیں جو اس سے پہلے اردو غزل کی روایت کا حصہ نہیں تھے۔ قاصر نے ان تجربات کو نہ صرف اردو غزل کی روایت میں شامل کر کے اس کو ایک نیا رنگ اور ذائقہ عطا کیا ہے بلکہ پرانے محسوسات کو ایک نیا ملبوس بھی فراہم کیا ہے۔

غلام محمد قاصر کی شاعری بتاتی ہے کہ محبت ہی وہ واحد طاقت ہے جو انسان کو مالی جبر، جنگی جنون اور شہری بیگانگی سے نجات دلا کر کائناتی ہم آہنگی سے روشناس کراتی ہے

ان کا مابعد النفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی ادراک محبت کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کرتے ہوئے، ان کی سرحدوں سے اگے لے جا کر روحانی ارتقا کا ذریعہ بناتا ہے

قاصر جیسے توانا اور تروتازہ لب و لہجے کی شاعر ہر دور میں زندہ رہیں گے اور ہر زمانے میں محبت کے پیامبر کہلائیں گے۔

حوالہ جات:

1. غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، اشاعت دوم، اپریل 2018، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، صفحہ 56
2. ایضاً،
3. ایضاً،
4. ہمابیگ، محبتوں کے دیس کے باسی۔۔۔غلام محمد قاصر، مشمولہ رنگ ارب غلام محمد قاصر نمبر، کتابی سلسلہ 20، اپریل تاجون 2022، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، صفحہ 308
5. غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، اشاعت دوم، اپریل 2018، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، صفحہ 286
6. غلام محمد قاصر، سرشاخ یقین، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست 2012، صفحہ 29
7. ایضاً، صفحہ 22
8. ایضاً، صفحہ 80
9. غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، اشاعت دوم، اپریل 2018، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، صفحہ 284
10. ایضاً، صفحہ 431
11. ایضاً، صفحہ 393
12. صوفی تبسم، مشمولہ اک شعر ابھی تک رہتا ہے، اشاعت دوم، اپریل 2018، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، صفحہ 526
13. غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، اشاعت دوم، اپریل 2018، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، صفحہ 56
14. ایضاً، صفحہ 452
15. ایضاً، صفحہ 41
16. ایضاً، صفحہ 43
17. ایضاً، صفحہ 98
18. ایضاً، صفحہ 191
19. ایضاً، صفحہ 380

20. ایضاً، صفحہ 363
21. ایضاً، صفحہ 98
22. ایضاً، صفحہ 56
23. احمد ندیم قاسمی، تسلسل کا شاعر، مشمولہ۔ غلام محمد قاصر، مشمولہ رنگ ارب غلام محمد قاصر نمبر، کتابی سلسلہ 20، اپریل تا جون 2022، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، صفحہ 193
24. غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، اشاعت دوم، اپریل 2018، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، صفحہ 21
25. ایضاً، صفحہ 305

خانزادہ عباداللہ/سمیہ زیب
ایم فل سکالر/پی ایچ ڈی سکالر

غلام محمد قاصر بطور ڈرامہ نگار

Abstract:

This study explores the significant contribution of the renowned Urdu ghazal poet Ghulam Mohammad Qasir to Urdu broadcast and television drama during the golden era of Pakistan Television (PTV) and Radio Pakistan in the 1970s and 1980s. Although primarily acclaimed for his lyrical poetry, Qasir transitioned into playwrighting upon persistent requests from broadcast directors such as Nusrat Thakur and Farmanullah Jan, producing over 70 radio and television plays, telefilms, and drama series. Integrating poetic delicacy, concise expression, and psychological nuance into visual drama, Qasir elevated screenwriting into dignified prose literature. His works rejected superficial romantic tropes in favor of deep social realism, depicting internal solitude, class inequality, economic hardship, human empathy, and educational awareness. Notably, Qasir also made pioneering contributions to children's drama most prominently through the acclaimed series Bhoot Bangla by introducing rationality, courage, and humor to dispel super-

stitious fears. Characterized by authentic dialogue, well-crafted suspense, and dynamic character arcs, Qasir's dramatic legacy, preserved notably in the special edition of Rang-e-Adab, establishes him as an accomplished prose stylist and a foundational figure in Urdu broadcasting literature.(

Keywords

Keywords: Ghulam Mohammad Qasir, Urdu Drama, PTV Peshawar Center, Radio Drama, Social Realism, Children's Literature (Bhoot Bangla), Dialogue Writing, Dramatic Art, Broadcasting Literature, Rang-e-Adab.

ڈرامہ ادب کی ایک بااثر، متحرک اور کثیر الابلاغ صنف ہے جس کی کامیابی فنی پختگی کا انحصار اس کے بنیادی تکنیکی عناصر اور منظم ترتیب پر ہوتا ہے۔ ڈرامہ محض ایک تحریری کہانی یا واقعاتی بیان نہیں بلکہ یہ انسانی عمل، تحرک سمعی و بصری تقاضوں کی ایک جاندار اور مجسم پیش کش کا نام ہے۔ڈرامہ یونانی زبان کے لفظ ڈراؤ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے کر کے دکھانا سنسکرت میں۔ اسے "ورشیہ کاو اور روپک "کہا گیا ہے۔ڈرامہ پرفارمنگ آرٹ ہے اور یہی خوبی اسے دیگر تخلیقی اصناف نثر سے ممتاز کرتی ہے۔ڈرامے کے داخلی عناصر قصہ کی روانی، تسلسل، تجسس تذبذب اور کشمکش شامل ہیں -اور خارجی عناصر اسٹیج، اداکار اور تماشائی ہیں۔ڈراما احاد ثلاثہ پر مبنی ہوتا ہے، احاد ثلاثہ سے مراد وحدت زمان، وحدت مکان اور وحدت عمل ہے۔۔ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، کردار، مکالمہ ،اسلوب بیاں شامل ہیں۔ڈرامے کی تین بنیادی اقسام ہیں۔ المیہ یا خزینہ، طربیہ ،اور میلو

ڈرامہ۔ پیش کش کے اعتبار سے بھی ڈرامہ کی تین ہی اقسام ہیں؛ سٹیج ڈرامہ، ریڈیائی ڈرامہ ٹی وی ڈرامہ۔

اردو ڈرامے کا آغاز لکھنو سے ہوا۔ لکھنو کے شاہی سٹیج پر واجد علی شاہ کا ڈرامہ رادھا کنہیا اسٹیج ہوا، اسی طرح امانت علی لکھنوی کا ڈرامہ اندر سبھا لکھا گیا اس کی تقلید میں بہت سی سبھائیں لکھی اور اردو سٹیج کی گئیں۔ اس کے بعد اسٹیج ڈراموں کا ایک سلسلہ چل نکلا آرام جی، نسروان جی رونق بنارسی، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، حکیم احمد شجاع، سید امتیاز علی تاج، قاضی عبدالغفار، ایم ڈی تاثیر، اردو سٹیج ڈرامے کے اہم نام ہیں جبکہ ریڈیائی اور ٹی وی ڈرامہ نگاروں میں میرزا ادیب، اصغر بٹ، محمد حسین، عشرت رحمانی، ابراہیم یوسف، رفیع پیر، کمال احمد رضوی، اشفاق احمد ضیا سرحدی، انور سجاد، فاطمہ ثریا بجیا، اور روف خالد جیسے کئی اہم اور معتبر نام شامل ہیں۔

ڈرامے کی اس ارتقائی روایت میں غلام محمد قاصر ایک ایسا معتبر نام ہیں جنھوں نے غزل کی لطافت، رمزیت، اختصار، اور نازک طبعی کو ڈرامے کے تکنیکی سانچے میں سلیقے سے پرو دیا، قاصر کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری خصوصا غزل ہے۔ قاصر کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری خصوصا غزل ہے، ڈرامہ نگاری کو انہوں نے کبھی اپنی پہچان نہیں بتایا لیکن اہل نظر اور اہل ذوق افراد کی فرمائش پر جب قاصر ڈرامے تحریر کیے تو پھر ڈرامہ نگاری کو صرف وقت گزاری، تفریح یا تجارتی نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ انہوں نے ایک باوقار بصری ادب کا درجہ عطا کیا۔ ان کا تخلیقی طرز عمل یہ رہا کہ انہوں نے روایتی ڈراموں کی طرح، رسمیت, سطحیت، عام رومانی موضوعات کی بجائے انسان کی باطنی تنہائی، خوابوں کی عدم تکمیل کے المیے، معاشی جبر اور طبقاتی ناہمواری فکری بنیاد بنایا۔ اکثر اد با اپنے اظہار مدعا اور مافی الضمیر کے لیے کسی خاص پیرایۂ اظہار اور کسی ایک صنف کا انتخاب کرتے ہیں لیکن ایسا بہت

کم ہوتا ہے کہ وہ خود کو ایک ہی صنف ادب یا پیرائیہ اظہار تک محدود رکھیں شعرا کرام نے نثر بھی تحریر کی اور بہت عمدہ نثر تحریر کی اسی طرح اکثر لکھاری وادیب نظم اور نثر دونوں ہی اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور ہر دو اصناف کا میاب اظہار کے لائق ہو جاتے ہیں۔ غلام محمد قاصر بنیادی طور ایک شاعر تھے اور انہوں نے شعر گوئی ہی کو اپنا مقصد حیات قرار دیا۔

شعر اک مشغلہ تھا قاصر کا
اب وہی مقصد حیات بنا(1)

تاہم غلام محمد قاصر کی نگارشات کا ایک بڑا حصہ نثر پر بھی مشتمل ہے۔ اگرچہ نثر لکھنا ان کا تخلیقی انتخاب ہر گز نہیں تھا۔ انھوں نے نثر زیاد لکھی بھی نہیں۔ ان کی نثر میں چند کتب کے دیباچے، تبصرے اور فلیپ یا وہ ڈرامے میں جو پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے تحریر کیے گئے۔ غلام محمد قاصر کی نثر کا کل سرمایہ ہیں۔

اس حوالے سے وہ خود رقم طراز ہیں:

نثر میں نے بہت کم لکھی ہے۔ سعید احمد اختر کی دیار شب اور سید سیف زلفی کی تابخاک کربلا کے دیباچے، نیز شوق جعفری کی غیر منقوط کتاب "ہالہ ملال اور احد نواز کی کتاب کا دیباچہ، سید انوار ظہوری کی طویل نظم مسجد اقصی کا تعارف، رئیس امروہوی کی کتاب ''الف'' پر تبصرہ اور رحمن بھوپالی کی کتاب "نظمانے پر تبصرہ مطبوعہ فنون تیشہ کرب'' سے پہلے مرتضیٰ برلاس کی غزل پر مضمون مطبوعہ فنون، احمد ندیم قاسمی کی غزل کا جائزہ یہ عنوان "چوتھا عنصر، مطبوعہ افکار ندیم نمبر، ایوب صابر اور قائم نقوی کے بارے میں تاثرات گویا ادب کے حوالے سے میرا کل نثری سرمایہ شاعری سے متعلق ہے۔(2)

ادبی حلقوں میں غلام محمد قاصر کی غزل گوئی نے بنیادی توجہ حاصل کیے رکھی، لیکن الیکٹرانک میڈیا پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان کے زریں دور میں ان کی ڈرامہ نگاری نے اردو نشریاتی ڈرامے کو فکری سنجیدگی لسانی رکھ رکھاؤ اور نفسیاتی اور شعوری گہرائی و گیرائی عطا کی۔ پاکستان میں ستر اور اسی کی دہائی کے دوران ٹیلی ویژن اور ریڈیو ذرائع ابلاغ کے ساتھ ساتھ ادبی و تہذیبی تربیت کے اہم مراکز تھے۔ غلام محمد قاصر نے پشاور سینٹر سے بطور ڈرامہ نگار الیکٹرانک میڈیا میں قدم رکھا۔ انہوں نے پی ٹی وی پشاور اور ریڈیو پاکستان کے لیے 70 سے زائد ڈرامے، ڈراما سیریلز، ٹیلی فلمز اور ڈرامائی نشریاتی پروگرام تحریر کیے، جنہیں ناظرین اور سامعین میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔۔ غلام محمد قاصر کا ڈرامہ نگاری کی طرف آنا کسی روایتی یا تجارتی غرض کا مرہون منت نہیں تھا۔ انہوں نے خود بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے وہ کوئی مروجہ ڈرامہ نگار نہیں تھے بلکہ الیکٹرانک میڈیا کے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز نے ان کی کہانی کاری، انسانی رویوں کی پرکھ، الفاظ کا تخلیقی استعمال، ان کی شاعری میں ڈرامائی کیفیات اور مکالماتی مہارت کو دیکھ کر ان سے ڈرامے تحریر کرنے کی فرمائش کی۔ اپنے متعدد انٹرویوز میں قاصر نے اس بات کی نشاندہی کی ہے۔ ریڈیو پاکستان پشاور سینٹر کے پروگرام بزم ادب میں پروفیسر نذیر تبسم کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

ڈرامے، اصل میں میری فیلڈ ہے نہیں، مجھ سے لکھوائے گئے یہاں نصرت ٹھاکر صاحب آئے تھے، وہ بطور شاعر مجھے جانتے تھے انہوں نے مجھے گھر سے بلوایا اور کہا کہ ڈراما لکھو، مین نے کہا کہ میں تو ڈرامے دیکھتا بھی نہیں ہوں لکھوں کیسے، انہوں نے کہا کہ جو آدمی شعر کہہ سکتا ہے وہ ڈرامہ بھی لکھ سکتا ہے، تو انہوں نے مجھ سے ایک ڈرامہ لکھنے کے لئے کہا۔ پہلا درامہ جو تھا اس کا نام تھا "اپنے اندھیرے" وہ میں نے لکھا اور اس پہ مختلف قومی

اخبارات خاص کر انگریزی کے اخبار، ویکلی انہوں نے اتنی زیادہ تعریف کی کہ میں خود حیران رہ گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔اس سے پھر حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے لکھنا شروع کیا۔(3)

ڈرامہ نگاری کی طرف قاصر کو مائل کرنے والوں میں ایک اہم نام فرمان اللہ جان کا ہے، راقمہ نے قاصر کی ڈرامہ نگاری کے حوالے سے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے فرمان اللہ جان صاحب سے رابطہ کیا تو انہوں نے قاصر صاحب سے اپنی ملاقات اور انہیں ڈرامہ نگاری کی طرف مائل اور قائل کرنے کے حوالے سے بتایا:

قاصر صاحب سے میری ملاقات کا سبب میرے بڑے بھائی تھے، میں نے قاصر کی شاعری پڑھی تو ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا، قاصر سے رابطہ کیا وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملے، دوران گفتگو میں نے انہیں ڈرامہ لکھنے کا مشورہ بھی دیا، انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ڈرامہ لکھنا میرے لئے ممکن نہیں میں تو ڈرامہ دیکھتا بھی نہیں لکھوں گا کیسے ؟اس کے بعد میں ان سے ڈرامہ لکھنے کے لئے مسلسل اصرار کرتا رہا، قاصر نے سب سے زیادہ ڈرامے میری پروڈکشن میں کیے۔(4)

ایک اور مقام پر ڈرامہ نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے قاصر رقم طراز ہیں:

پاکستان ٹیلی ویژن کے حوالے سے بھی بعض افراد کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، اگر ٹیلی ویژن سے میرا تعلق صرف شاعر کا ہوتا تو اس تذکرے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ مجھے نصرت ٹھاکر صاحب نے گھر سے بلوایا اور کہا کہ جو شخص لفظ کا استعمال جانتا ہے وہ ڈرامہ بھی لکھ سکتا ہے۔ان کے اسی حسن ظن نے مجھ سے دو ڈرامے لکھوائے، اور ان اولین کاوشوں کو پروڈیوس کرنے کا رسک بھی نصرت ٹھاکر صاحب نے لیا۔ ٹھاکر صاحب کے رویے اور جناب شوکت پرویز صاحب کی عالمانہ گفتگو سے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ ٹی وی کے حوالے سے میں نے شوکت پرویز کی باتوں سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔اس کے علاوہ

ارباب خان، صلاح الدین، شوکت علی، جہاں زیب سہیل اور شاہد مسعود نے کسی نہ کسی حوالے آس، دھند اور سر راہ خود مجھے بھی اچھے لگے۔ سے مجھے ضرور متاثر کیا ہے۔ میرے سب سے زیادہ نغمے اور ڈرامے فرمان اللہ جان نے پروڈیوس کیے ہیں۔ جن میں سے قد آور، رگ جان، تقاضا، آس، دھند اور سر راہ خود مجھے بھی اچھے لگے۔(5)

اگرچہ ڈرامہ قاصر کی تخلیقی ترجیحات میں شامل نہیں تھا، ڈرامہ انڈسٹری میں غلام محمد قاصر کے اس غیر رسمی ورود کے باوجود قاصر نے ڈرامائی ساخت، مناظر کی ترتیب، سسپنس کی تخلیق اور ناظرین کی نفسیاتی گرہوں کو کھولنے کے فن پر مکمل تصرف کا مظاہرہ کیا غلام محمد قاصر کے تحریر کردہ کھیلوں میں موضوعاتی ندرت، معاشرتی اصلاح اور انسانی تعلقات کا فکری جائزہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ایک افسانہ نگار ،اپنے افسانوں کے ذریعے کرداروں کی لفظی تصویر بناتا ہے، ان کی لفظی پیکر تراشی کرتا ہے اور ڈرامہ نگار ان کرداروں کو سٹیج پر کیمرے کے ذریعے جیتے جاگتے انسانوں کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ کردار نگاری ڈرامے کی جان ہے بہترین کردار وہی تخلیق کر سکتا ہے جو انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ رکھتا ہو اسے اپنے کرداروں سے محبت ہو، وہ ان میں سانس لیتا ہو ان کی اچھائیوں اور برائیوں کو سمجھتا ہو ان کے ساتھ جیتا ہو ان کے ساتھ ہنسنے اور رونے کا ہنر رکھتا ہو، یہ وہ صفات میں جو غلام محمد قاصر کی ڈرامہ نگاری میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ غلام محمد قاصر کے ڈراموں کی اہم خوبی تجسس ہے جو آخر تک برقرار رہتا ہے۔ غلام محمد قاصر کی ڈرامہ نگاری کے متعلق ڈاکٹر طارق ہاشمی رقم طراز ہیں:

ان کے مکالمے بڑے برجستہ، تیکھے اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈرامہ نگار نے لفظوں کی پھلجھڑی چھوڑی ہے لیکن یہ ایسی پھلجڑی ہے، جو افق پر چمکنے کے بعد بھی بجھتی نہیں بلکہ اپنا تاثر ناظرین کے ذہنوں پر نقش کر دیتی ہے اور ناظرین کے شعور، دل

اور دماغ پر اثر چھوڑتی ہے۔ان کے تخلیق کردہ کرداروں سے دیکھنے والوں کو جذباتی وابستگی ہو جاتی ہے۔ یہ کردار حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے ارد گرد پھرتے نظر آتے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔(6)

غلام محمد قاصر نے سماجی مسائل، فرد کی داخلی تنہائی، قبائلی روایات، ایثار اور قربانی جیسے موضوعات کو اپنے ڈراموں میں پیش کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے بچوں کے لئے بھی ڈرامے تحریر کیے۔ بچوں کے لئے تحریر گیا ڈرامہ سیریل بھوت بنگلہ نہایت مقبول ہوا۔ یہ ایک نہایت دل چسپ اور منفرد ڈرامہ تھا، قاصر کا کہنا ہے کہ یہ ڈرامہ انہوں نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

بشری رفیق نے بھوت بنگلہ کے حوالے سے مجھے یہ احساس دلایا کہ بچوں کے لئے لکھنا غیر اہم کام نہیں ہے۔ مغرب میں لوگ اپنی ذات کی چار دیواری سے نکل کر بچوں کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔دنیا میں سب سے مقبول ادب fairy tales ہے جو بچوں کے لئے لکھا جاتا ہے لیکن ان کہانیوں کی اپیل سب کے لئے ہے۔ ہم لوگ اپنی ذات کی بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس لئے بچوں کے ادب کو کم تر درجہ دیتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ بچوں کے لئے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں... (7)

بچوں کے لیے ڈرامہ نگاری انتہائی پیچیدہ فن ہے، کیونکہ اس میں تفریح اور تربیت کے توازن کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ قاصر کا کھیل بھوت بنگلہ اس لحاظ میں ایک یادگار اور کامیاب تجربہ تھا۔ موضوع و تکنیک کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ڈرامہ کی کہانی ایک پراسرار اور نام نہاد بھوت بنگلے کے گرد گھومتی ہے۔ قاصر نے تجسس اور پراسراریت کی فضا قائم کر کے بچوں کے دل و دماغ سے روایتی خوف اور وہم کو دور کرنے کا سبق دیا۔ نفسیاتی و اخلاقی پہلو

سے نظر ڈالی جائے تو ڈرامے میں خوف کے بجائے مزاح عقلیت پسندی اور جرات کو فروغ دیا گیا۔اس کا مقصد بچوں کو یہ باور کرانا تھا کہ نام نہاد فوق الفطرت یا خوفناک کہانیاں اکثر افواہ ہوتی ہیں اور علم و جرات کے ذریعے حقیقت کو بے نقاب کیا جاسکتا ہے۔ یہ ڈراما پی ٹی وی کے بچوں کے پیراڈائم میں ایک طویل عرصے تک مقبول ترین کھیل کے طور پر یاد رکھا گیا۔۔ بھوت بنگلہ کے علاوہ قاصر نے بچوں کے لئے ایک کہانی بڑی پرانی کے عنوان سے الف لیلہ کی کہانیوں کو آسان اور بچوں کی دلچسپی کے مطابق ڈرامائی شکل میں تحریر کیا۔ اس کے علاوہ قاصر نے بچوں کے لیے تفریحی ایک پروگرام بھی تحریر کیا، پروگرام کا نام تھا" یہ دنیا میری ہے "اس پروگرام میں مختلف سیگمنٹ ہوتے تھے۔ایک میں ننھا مصور عماد ہر ہفتے کوئی اصلاحی کارٹون بناتے تھے۔اور دل چسپ و عجیب خبریں ہوتی تھی۔25 منٹ کے پروگرام میں 10 منٹ کا ڈرامہ پیش کیا جاتا تھا جس کا نام "شہکار" تھا۔اس پروگرام کے پروڈیوسر فرحت اللہ قریشی تھے شہرت پذیرائی اور مقبولیت کے لحاظ سے یہ مختصر ڈرامہ شہکار بھی بچوں کے لئے تحریر کردہ صف اول کے ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔

غلام محمد قاصر کے سماجی ڈراموں کو موضوعاتی اعتبار سے دیکھیں تو ان ڈراموں میں معاشرتی ناہمواری، غربت، ناانصافی، طبقاتی امتیاز، سماجی تعصب، اور تعلیم کی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے۔ان کا ایک ڈرامہ ''مہمان خصوصی ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ء میں پاکستان ٹیلی ویژن پشاور مرکز سے نشر ہونے والی ڈرامہ سیریز؛ سچی کہانیوں کے سلسلے کا کھیل ہے جس کے ہدایت کار اور پیش کار آغا قزلباش تھے۔ یہ ڈرامہ تعلیم کی اہمیت کے حوالے سے ہے۔ اس کا بنیادی موضوع غربت، تعلیم اور جدوجہد کی اہمیت کو واضح کرنا ہے۔ان کے ڈرامے میں معاشرتی حقائق کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے جو کسی تشنہ لب کو علم کی پیاس بجھانے سے روکنے کی سکت رکھتی ہے۔ اس ڈرامے کا ایک اور پہلو ان پڑھ جاہل اور پڑھے لکھے باشعور انسان کی

سوچ کا فرق بھی ہے۔اس ڈرامے میں معاشرے کے ذہنی بیمار لوگوں کی سوچ کو واضح کیا گیا ہے۔اس کا مثبت کردار نجمہ ہے جو مثبت سوچ اور منفرد رویے کی حامل ہے۔اس کی اخلاقی و ذہنی تربیت کے سبب ایک غریب،ان پڑھ لیکن علم کا طالب اعجاز اپنی علم کی پیاس بجھانے میں کامیاب ہو گیا۔اس نے نہ صرف اپنی تعلیم مکمل کی بلکہ اس معاشرے کا ایک اہم اور معزز شخص بن گیا، جس نے بعد ازاں شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا۔

ڈرامے کی پیش کش نہایت فطری اور مکالمے جاندار ہیں اس ڈرامے کا ایک منظر ملاحظہ کیجیے:

پرنسپل کا دفتر/پرنسپل/اور نجمہ

پرنسپل: (غصے میں) آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

مس نجمہ: میٹرک اس نے پاس کر لیا ہے۔اب اسے پڑھانے کا تمہارے پاس کیا جواز ہے؟ سارے ماحول کو کیوں خراب کرتی ہو؟

نجمہ: میڈم آخر ہمارے قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے۔ایک ناخواندہ کو پڑھانا ہمارے سٹوڈنٹس کے لیے ایک سوشل ورک ہے۔انہیں نمبر ملتے ہیں اس کام کے۔اور میں کسی کو پڑھاؤں تو وہ جرم بن جاتا ہے۔ناقابل معافی جرم۔آخر یہ سب کیا ہے؟

پرنسپل: میں اور کچھ نہیں جانتی۔۔۔۔بس آئندہ تم نہیں پڑھاؤ گی اسے۔

نجمہ: ود ڈیو ریسپیکٹ میڈم میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔ایک آدمی مجھ سے پڑھنا چاہے اور میں انکار کر دوں۔میرا دل نہیں مانتا۔

پرنسپل: جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔تمہیں ٹرانسفر کیا جا سکتا ہے۔اس کالج سے۔ ویسے بھی تمہارا ٹینیور پورا ہو چکا ہے۔

نجمہ: ٹرانسفر تو کوئی سزا نہ ہوئی۔ میں اپنے اس جرم کے لیے اس سے بڑی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔

پرنسپل: میں نے آج تک اس مسئلے کو ذاتی نہیں بنایا تم اگر ضد کرتی ہو تو پھر یاد رکھو تمہیں ایسی سزا بھی مل سکتی ہے جو شاید تم سوچ بھی نہ سکو۔

نجمہ: میڈم میرے اس عمل کے پیچھے انعام کا کوئی لالچ نہیں تھا اس لیے میں کسی سزا سے خوفزدہ نہیں ہوں گی۔ بلکہ ہر سزا کو میں ایک انعام سمجھ کر قبول کروں گی۔

(پرنسپل غصے سے بے قابو ہونے لگتی ہے۔ لگتا ہے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن پھر ضبط کر جاتی ہے۔ اور میز کی درازیں کھول کر کاغذ نکالنا چاہتی ہے)

پرنسپل: (نجمہ سے) بس اب تم جا سکتی ہو۔

نجمہ: شکریہ (یہ کہہ کر نکل جاتی ہے۔)(8)

قاصر نے متعدد عید شو اور موسیقی کے پروگراموں کے لیے سکرپٹ لکھے۔ عید یوم اقبال، یوم قائد کے سلسلے میں خصوصی ڈرامے تحریر کیے۔ قاصر کے مقبول ترین ڈرامہ سیریلز میں سے ایک ڈرامہ سیریل "تلاش" (پی ٹی وی پشاور سینٹر) ہے۔ "تلاش" کے پروڈیوسر شوکت علی تھے۔ اس سیریل کی بنیادی فکری جدید معاشرے میں انسان کی اندرونی تنہائی رشتوں کے زوال اور اخلاقی قدروں کی تلاش ہے۔ ڈرامے میں یہ دکھایا گیا کہ مادیت پرستی کے دور میں فرد کس طرح اپنی اصل شناخت اور روحانی سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ قاصر نے اس سیریل میں سماجی طبقات کے تضادات، قبائلی روایات اور معاشرتی مسائل کو کو ڈرامائی تناؤ کے ساتھ ابھارا۔ اس سیریل کے تمام کردار کسی نہ کسی نفسیاتی یا معاشرتی الجھن کا شکار تھے، جن کے ذریعے مصنف نے ناظرین کو فکر و تدبر کی دعوت

د تلاش" نے پشاور سینٹر سے نشر ہو کر ملک گیر سطح پر شہرت حاصل کی اور اسے پی ٹی وی کی نشریاتی تاریخ کے اہم اور معیاری سیریلز میں شمار کیا گیا۔

غلام محمد قاصر کے ڈراموں میں کردار مسلسل کوشش اور جد وجہد سے اپنی منزل پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کا ڈرامہ سدرہ کے نام ۱۹۹۳، پاکستان ٹیلی ویژن پشاور مرکز سے نشر ہونے والی ڈرامہ سیریز، سچی کہانیوں کے سلسلے کا ایک کھیل ہے۔ اس ڈرامے میں ڈرامہ نگار نے ادبا اور شعرا کے حالات زندگی کے بارے میں تحریر کیا ہے

اپنے ڈراموں میں غلام محمد قاصر نے فن کار اور شاعر کی زندگی کو بھی مرکز توجہ بنایا ہے اور ان کی مفلسی، تنگ دستی اور مفلوک حالی کو اپنے فن پاروں کے ذریعے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی تحریروں سے اس منظر نامے کی عکاسی ہوتی ہے کہ فن کار مفلسی، تنگ دستی اور خستہ حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھیں بنیادی ضروریات تک رسائی میسر نہیں۔ روٹی کپڑے کے لیے بلکتے اور علاج کو ترستے اس جہان فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ یہ لوگ قلم دوست ہوتے ہیں۔ معاشرے کا اہم رکن ہونے کے باوجود شاعر گمنامی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ معاشرے کی اس تلخ حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اہل قلم معاشرے کا اہم رکن ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں، جس کے یہ مستحق ہیں۔ بنیادی ضروریات سے محروم ہوتے ہیں۔ غربت کی وجہ سے انھیں غموں کے کڑوے کسیلے گھونٹ پینا پڑتے ہیں۔ اپنوں کے تلخ رویے برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ لوگ ایسی شخصیات سے صرف مطلب کے لیے ملتے اور رابطہ رکھتے ہیں۔ اس کھیل کے مرکزی کردار جمال کے حالات زندگی بھی کچھ ایسے ہی ہیں جے اپنوں نے دھتکار دیا۔ راہی جیسے دوستوں نے اس سے دوستی محض اپنے مفاد کے لیے رکھی۔ اس ڈرامے میں جہاں معاشرے کے منفی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے جمال کو ناامید و مایوس دکھایا گیا ہے اس ڈرامہ میں قاص صاحب نے

مختلف مقامات پر عمدہ شاعری کے نمونے بھی تحریر کیے ہیں، شاعر قاصر کا بنیادی حوالہ تھی اور اس کا اظہار ان کی ہر تخلیق میں نمایاں ہے۔

غلام محمد قاصر کے تحریر کردہ کئی ڈراموں کے سکرپٹ اب میسر نہیں۔ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر میں ان کے تحریر کردہ ۴ ڈرامے شامل کیے گئے ہیں۔

ان میں سدرہ کے نام، گم شدہ، سب جھوٹ ہے، اور مہمان خصوصی شامل ہیں۔ سدرہ کے نام کا بنیادی موضوع ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی ناقدری اور زبوں حالی ہے، گم شدہ، کا موضوع بے روزگاری، غربت، تعلیم کی اہمیت، اور کمزور خاندانی نظام ہے، اسی سلسلے کا ایک کھیل سب جھوٹ ہے، میں قاصر نے جہیز کی لعنت، لالچ، ہوس، مرد کی اجارہداری، اور پس ماندہ طبقات کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔

یہ تمام ڈرامے ۱۹۹۷ میں پاکستان ٹیلی وژن پشاور مرکز سے نشر ہونے والے ڈرامہ سیریز، سچی کہانیاں کے سلسلے کے لئے تحریر کیے گئے۔ ان ڈراموں میں نفسیاتی الجھنوں، اندرونی کشمکش، خواہشات، معاشرتی جبر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کے کردار فطری انداز میں انسانی جزبات اور رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ قاص کے تخلیق کردہ کردار جامد نہیں، وہ کہانی کے تسلسل کے ساتھ مسلسل ارتقاپذیر ہیں۔

مکالمے کسی بھی ڈرامے کی جان ہوتے ہیں قاصر کے ڈراموں میں مکالمہ نگاری فطری اور زندگی کے قریب ہے۔ یہ قاصر کی تخلیقی مہارت اور فنی پختگی کو ظاہر کرتی ہے۔ قاصر لفظ کی اہمیت اور اس کے استعمال سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مکالموں میں تاثیر ہے اور ان کے کردار جاندار ہیں۔ تجسس جو کسی بھی کہانی مین دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے، قاصر کے ڈراموں میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ناظرین آخر تک کہانی کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔

قاصر کے دیگر اہم ڈراموں میں طویل دورانیے (۹۰ منٹ) کے کھیل، شام سے پہلے، آئینہ، آواز، وعدہ اور گارڈ شامل ہیں۔ ۵۰ منٹ دورانیے کے کھیلوں میں، سراب، اپنے اندھیرے، امر بیل، پلاٹ، کنارے کنارے، سر راہ، دھند، تقاضا، آس گھروندہ، چھاوں، قد آور، شیشے کا گھر، دھندلے شیشے، خاک دل، سرخ آسمان، نمایاں ہیں۔

قاصر ایک صاحبِ اسلوب شاعر تھے، اس لیے ان کی نثر میں بے ساختگی بر جستگی اور ایک خاص شعری آہنگ پایا جاتا ہے۔ وہ ڈرامائی کرداروں کے منہ سے غیر ضروری طویل مصنوئی یا خطابی زبان نہیں کہلواتے تھے، بلکہ بول چال کی سادہ لیکن باوقار زبان استعمال کرتے تھے جس میں فصاحت اور بلاغت قائم رہتی تھی۔

قاصر کو انسانی ذہن کی تہوں اور مابعد النفسیاتی و داخلی الجھنوں سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے ڈراموں کے کردار محض بیرونی حوادث کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ ان کی اصل جنگ ان کی ذات کے اندر جاری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پلاٹ میں خارجی ہنگامہ آرائی کے بجائے داخلی تضاد اور نفسیاتی سسپنس زیادہ گہرا ہوتا ہے احمد ندیم قاسمی نے قاصر کے فکری رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انسان دوستی اور دردمندی ان کا بنیادی مسلک ہے۔ یہی فکری عنصر ان کی ڈرامہ نگاری کا بھی وصف ہے۔ وہ اپنے ڈراموں میں سچائی، اخلاقی اقتدار مظلوم کی حمایت اور معاشرتی ناانصافی کے خلاف < احتجاج خاموش احتجاج کو مرکزی دھارے میں رکھتے تھے۔

ادبی ناقدین کی یہ متفقہ رائے رہی ہے کہ غلام محمد قاصر کی غزل گوئی کے چمکتے ہوئے آفتاب نے ان کی نثری نگارشات اور ڈرامہ نگاری کی صلاحیتوں کو کچھ عرصے کے لیے ادبی منظر نامے پر اوجھل رکھا۔ ان کا شمار اردو غزل کے صف اول کے شعرا میں ہونے کی وجہ سے اکثر محققین نے ان کے شعری مجموعوں پر ہی کام کیا اس خلا کی تلافی اور قاصر کی ڈرامہ

نگاری کو محفوظ و مدون کرنے کے سلسلے میں کراچی کے ممتاز ادبی جریدے سہ ماہی رنگ ادب نے تاریخی قدم اٹھایا۔ رنگ ادب کے مدیر اعزازی شاعر علی شاعر نے قاصر کے صاحبزادے عماد قاصر کے اشتراک سے 720 صفحات پر مشتمل ایک جامع غلام محمد قاصر نمبر شائع کیا۔ قاصر کی تحریر کردہ نثر کا ذخیرہ اس شمارے کے پہلے حصے "نثر" قاصر" میں ان کے لکھے گئے ادبی مضامین فلیپس دیباچے اور نامور شعرا پر ان کے تحریر کردہ تبصرے یکجا کیے گئے۔ علاوہ ازیں قاصر کے فن ڈرامہ نگاری کو تحریری صورت میں محفوظ کرنے کے لیے اس خصوصی شمارے میں ان کے تحریر کردہ چار مکمل ڈرامے شائع کیے گئے۔ ان متون کی اشاعت سے ادبی دنیا کو پہلی بار یہ ادراک ہوا کہ قاصر کا ڈراما صرف نشریاتی مواد نہیں بلکہ پائیدار نثری ادب کا حصہ ہے اور رہے گا۔ غلام محمد قاصر کی ڈرامہ نگاری اردو ڈرامے کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ انہوں نے الیکٹرانک میڈیا کی نشریاتی ضروریات کو ادب کے اعلیٰ معیار پر پورا کر کے دکھایا۔ ان کا ڈراما جہاں اجتماعی معاشرتی اقدار اور فرد کے اندرونی بحران کی ترجمانی کرتا ہے، وہیں عقلی بصیرت کا بہترین نمونہ ثابت ہوتا ہے۔ سہ ماہی رنگ ادب" کی جانب سے ان کے چار ڈرامائی متون کی اشاعت اور تنقیدی جائزوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غلام محمد قاصر جتنے بڑے غزل گو شاعر تھے، نثری اور ڈرامائی فضاء میں بھی وہ اتنے ہی قد آور اور صاحب اسلوب فنکار تھے۔

قاصر کی ڈرامہ نگاری کے حوالے سے مشہور شاعر اور ڈرامہ پروڈیوسر عزیز اعجاز لکھتے ہیں:

بہ طور پروڈیوسر پاکستان ٹیلی وژن پشاور مرکز مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ غلام محمد قاصر کے تحریر کردہ ۵۰ منٹ دورانیہ کے انفرادی ڈراموں پہلی سی محبت، اور سفر در سفر کی ہدایات میں نے دیں۔ غلام محمد قاصر کے تحریر کردہ ڈراموں میں ان کے شاعرانہ اوصاف اور صلاحیتوں کا رنگ نمایاں ہے۔ ادبی چاشنی سے بھرپور دلوں کو چھو لینے والے مکالمے، عمدہ

کردار نگاری، کہانی کا ڈرامائی اتار چڑھاؤ حقیقی زندگی سے اخذ کردہ واقعات کا تسلسل اور فطری بہاؤ ڈرامے کے پلاٹ پر مصنف کی مضبوط گرفت، انسانی نفسیات کا گہرا ادراک ہونے کی وجہ سے ڈرامے کے کردار تخلیق کرتے ہوئے کرداروں کی نفسیاتی الجھنیں، اور پس منظر کرداروں میں جان ڈال دیتا تھا۔(9)

غلام محمد قاصر کے تحریر کردہ ڈرامے اردو کے تخلیقی ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ یہ ان کے وسیع مشاہدے، انسانی رویوں پر قاصر کی گہری نظر، اور ان کی فنکارانہ بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قاصر کے تحریر کردہ ڈراموں نے پی ٹی وی پشاور سینٹر کو ایک منفرد شناخت عطا کی۔

حوالہ جات:

1۔ غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اپریل 2018، صفحہ نمبر 56
2۔ غلام محمد قاصر، پس منظر مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی۔ اپریل تا جون 2022، صفحہ نمبر 31
3۔ انٹرویو غلام محمد قاصر/نذیر تبسم مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اپریل تا جون 2022، صفحہ نمبر 174
4۔ ٹیلفونک انٹرویو فرمان اللہ جان/سمیہ زیب، بتاریخ اگست 2026ء 8:30 بجے شام
5۔ غلام محمد قاصر، پس منظر مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی اپریل تا جون 2022، صفحہ نمبر 31
6۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی، غلام محمد قاصر: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، 2025، صفحہ نمبر 98
7۔ غلام محمد قاصر، پس منظر مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی اپریل تا جون 2022، صفحہ نمبر 31

8۔ غلام محمد قاصر، ڈرامہ مہمان خصوصی، مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اپریل تا جون 2022، صفحہ 163

9۔ عزیز اعجاز، غلام محمد قاصر کی ڈرامہ نگاری، مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی اپریل تا جون 2022، صفحہ 348

امامہ میر
ایم فل سکالر جامعہ ہزارہ مانسہرہ

غلام محمد قاصر: ایک منفرد مرثیہ نگار

ملخص:

(غلام محمد قاصر جدید اردو شاعری کے منفرد و ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری خصوصا غزل کو ایک نئی حسیت اور ذائقے سے آشنا کیا۔ قاصر کا تعلق اردو غزل کے دور زریں سے ہے، ستر کی دہائی جدید اردو غزل کے عروج کا دور ہے جب غزل میں روایت و جدیدیت کے حسین امتزاج اور عصری حسیت سے ہم آہنگ کر کے اک نئی جہت عطا ہوئی۔ تاہم قاصر نے محض غزل ہی میں اپنے فن کا کمال نئی دکھایا، قاصر کے شعر کی اساس اللہ، رسول اور اہل بیت کی محبت پر استوار ہے، اس تناظر میں دیکھا جائے تو قاصر کا شمار ان باکمال شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے واقعہ کربلا کو محض ایک تاریخی سانحے یا روایتی رثائی موضوع کے طور پر پیش کرنے کی بجائے ایک زندہ، متحرک اور آفاقی استعارے کی صورت میں برتا ہے۔ ان کی شاعری میں کربلا ظلم و عدل، جبر و حریت، ایثار و وفا اور انسانی وقار کی ابدی کشمکش کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ قاصر کے ہاں امام حسینؑ، حضرت عباسؑ، حضرت زینبؑ اور حضرت علی اصغرؑ کی شخصیات تاریخی کرداروں سے آگے بڑھ کر اخلاقی استقامت، مزاحمت، وفاداری، صبر اور معصومیت کی علامتوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کی رثائی شاعری کے علاوہ ان کی غزل میں بھی پیاس، فرات، صحرا، لہو، خیمہ، علم اور سجدہ جیسے استعارے عصرِ حاضر کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل سے گہرا ربط پیدا کرتے ہیں، جس کے باعث ان کا کلام صرف عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ انسانی شعور کی بیداری کا مؤثر وسیلہ بھی بن جاتا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں غلام محمد قاصر کی رثائی شاعری کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی منتخب نظموں اور سلامیہ کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے کربلا کے علامتی نظام، استعاراتی تشکیل، جدید شعری حسیت اور اسلوبیاتی کا جائزہ لیا گیا ہے، غلام محمد قاصر نے کربلا کو ایک زندہ فکری روایت کے طور پر اپنی شاعری میں اس طرح برتا ہے کہ وہ ہر عہد کے انسان کے لیے ظلم کے خلاف مزاحمت، اخلاقی جرأت اور انسانی آزادی کا استعارہ بن جاتا ہے۔ یہی فکری امتیاز غلام محمد قاصر کی رثائی شاعری کو جدید اردو ادب میں ایک منفرد اور قابلِ قدر مقام عطا کرتا ہے۔)

کلیدی الفاظ:

غلام محمد قاصر، رثائی شاعری، کربلا، استعارہ، امام حسینؑ، حضرت عباسؑ، حضرت زینبؑ، حضرت علی اصغرؑ، علامت نگاری، مزاحمت، جدید اردو شاعری

واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا ایک ایسا عظیم اور فیصلہ کن باب ہے جس نے محض مذہبی شعور ہی نہیں بلکہ انسانی تہذیب، ادب، فکر اور ثقافت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ امام حسینؑ اور ان کے جان نثار رفقا کی قربانی نے حق، عدل، حریت، ایثار اور انسانی وقار کے ایسے آفاقی تصورات کو جنم دیا جو ہر دور میں ظلم اور جبر کے خلاف مزاحمت کی علامت بن کر سامنے آتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں کربلا ایک تاریخی واقعے سے بڑھ کر ایک زندہ استعارہ بن چکی ہے، جس کے ذریعے مختلف شعرا نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل کو بیان کیا ہے۔

اردو کلاسیکی مرثیے میں واقعۂ کربلا کی جزئیات، کرداروں کی عظمت اور سانحۂ کربلا کی درد انگیزی بنیادی موضوعات تھے، جبکہ جدید اردو شاعری میں کربلا کو ایک فکری،

تہذیبی اور علامتی نظام کے طور پر برتا گیا۔ اس جدید رویے میں کربلا ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج، انسانی آزادی کی جدوجہد اور اخلاقی استقامت کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں تقدیسی اور رثائی ادب کو ہمیشہ ایک ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ حمد، نعت، منقبت، سلام، مرثیہ اور نوحہ اس روایت کی مختلف صورتیں ہیں۔ جن کے ذریعے شعرا نے عشقِ رسول ﷺ اور حب اہلِ بیتؑ کو اپنے فکری اور جمالیاتی شعور کا حصہ بنایا۔ میر انیس، مرزا دبیر، محسن کاکوروی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، رئیس امروہوی، احمد ندیم قاسمی اور دیگر شعرا نے اس روایت کو اپنے اپنے عہد کی فکری ضرورتوں کے مطابق آگے بڑھایا۔ جدید اردو شاعری میں غلام محمد قاصر کا نام ان شعرا میں شامل ہے جنہوں نے رثائی شاعری کو محض عقیدت کے اظہار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے عصرِ حاضر کے انسانی، اخلاقی اور تہذیبی مسائل سے جوڑ کر ایک نئی معنویت عطا کی۔

غلام محمد قاصر (1944–1999) جدید اردو شاعری کے ان اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے غزل، نظم اور دیگر اصنافِ سخن میں اپنی انفرادی شناخت قائم کی۔ اگرچہ ان کی بنیادی شناخت ایک غزل گو شاعر کی ہے، تاہم ان کے رثائی کلام میں بھی ان کا تخلیقی شعور پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں واقعۂ کربلا محض ماتم یا تاریخی بیان کا موضوع نہیں بلکہ ایک مسلسل فکری مکالمہ ہے، جس کے ذریعے شاعر اپنے عہد کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی صورتِ حال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے ہاں امام حسینؑ حق و صداقت، حضرت عباسؑ وفاداری، حضرت زینبؑ استقامت اور حضرت علی اصغرؑ معصوم حق کی علامت بن جاتے ہیں، جبکہ پیاس، فرات، صحرا، خیمہ، علم، سجدہ اور لہو جیسے عناصر ایک وسیع علامتی نظام تشکیل دیتے ہیں۔

ان کے ہاں کربلا کا تصور محض عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ جدید انسان کی فکری بے چینی اور اخلاقی جستجو کا استعارہ ہے۔ قاصر نے واقعۂ کربلا کو اپنے عہد کی سماجی اور تہذیبی صورتِ حال سے مربوط کر کے اسے نئی معنویت عطا کی ہے، ان کے رثائی کلام کی اصل قوت یہ ہے کہ وہ کربلا کو ایک زندہ فکری روایت کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس کے استعارات آج بھی انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غلام محمد قاصر کی رثائی شاعری صرف سانحۂ کربلا کی یاد تازہ نہیں کرتی بلکہ ہر دور کے انسان کو حق، انصاف، حریت اور اخلاقی استقامت کی اقدار سے وابستہ رہنے کا شعور بھی عطا کرتی ہے۔ غلام محمد قاصر جدید اردو شعری منظر نامے کا ایک اہم نام ہے۔ ایک ایسا نام جس نے عصری ادبی تناظر میں نہ صرف اپنی جگہ بنائی، بلکہ ایک قابل قدر مقام بھی بہ خوبی حاصل کیا۔ غلام محمد قاصر کے انتقال کو دو دہائیوں سے زائد عرصہ گزر چکا، لیکن ہماری ادبی دنیا میں آج بھی ان کا شعری حوالہ ملتا ہے اور ان کی ادبی شناخت باقی ہے جو یقیناً بڑی خوش کن بات ہے۔ قاصر کی شناخت بنیادی طور پر ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے ہے، اور بجا طور پر ہے۔ تاہم اُنھوں نے دوسری اصناف سخن میں بھی جو طبع آزمائی کی ہے، اہل نظر بلاشبہ اس کی بھی داد دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کوئی ایک صنف کسی شاعر کے تخلیقی جوہر کے اظہار کا سب سے اہم اور مؤثر ذریعہ ہوتی ہے۔ تاہم یہ م یہ بات بھی اُصولی طور پر طے ہے کہ ایک اعلیٰ تخلیقی جوہر کا مالک فن کار جس صنف کو بھی اظہار کا ذریعہ بناتا ہے، اس میں اپنے فن اور اسلوب کی ایک مثال قائم رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سطح کسی خاص صنف سے مخصوص نہیں ہوتی، بلکہ بنیادی طور پر اس کے تخلیقی جوہر سے تعلق رکھتی ہے۔ چناں چہ اس کے اظہار کے ہر تخلیقی وفنی دائرے میں اپنا سراغ دیتی ہے۔

غلام محمد قاصر کا رثائی اور تقدیسی کلام اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اہلِ بیتِ اطہارؑ سے محبت ان کے فکری وجود کا بنیادی حوالہ ہے۔ ان کی شاعری میں کربلا محض ایک تاریخی

واقعہ نہیں بلکہ ظلم و عدل، حق و باطل، وفا و بے وفائی اور حریت و جبر کے درمیان جاری انسانی کشمکش کا دائمی استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سلام، مناقب اور نظمیں ہر دور کے انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

سچ کے خیمے تک پہنچا جو ظلم کا پہلا تیر
آج اسی کی زد پہ فلسطیں، بوسنیا، کشمیر
ہر صحرا پر پڑنے لگا ہے اس صحرا کا عکس
تیرے لہو نے جس پہ کیا تھا شہر وفا تعمیر
بے گھر بھوکے پیاسے بچے، آگ اگلتی ریت
ہر تصویر کے پس منظر میں اصغر کی تصویر (1)

غلام محمد قاصر کے ہاں تقدیسی شاعری جذباتی وابستگی سے آگے بڑھ کر فکری مزاحمت اور انسانی آزادی کے تصور میں ڈھل جاتی ہے۔ ان کے نزدیک کربلا ایک زندہ شعور ہے جو ہر عہد میں انسان کو ظلم کے خلاف کھڑا ہونے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ قاصر کی عقیدت روایت سے جڑی ہوئی ضرور ہے لیکن اس میں جدید انسان کے فکری سوالات بھی پوری شدت سے موجود ہیں۔

عقیل عباس جعفری کی رائے میں

غلام محمد قاصر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اہلِ بیتؑ کی تاریخ کو محض ماضی کا باب نہیں سمجھتے بلکہ اسے حال کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل کی تعبیر بنا دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی تقدیسی شاعری آج بھی تازگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ (2)

غلام محمد قاصر کی تقدیسی فکر اور شاعری کا بنیادی سرچشمہ عشقِ رسول ﷺ اور محبتِ اہلِ بیتؑ ہے۔ تاہم ان کی شاعری میں یہ محبت رسمی یا روایتی انداز میں نہیں آتی بلکہ

انسانی عظمت، صبر، استقامت اور حریت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کے نزدیک کربلا انسان کی اخلاقی بقا کی جنگ ہے۔

ان کی نظم "علی اصغر علیہ السلام" اس احساس کی بہترین مثال ہے۔ شاعر چھے ماہ کے معصوم بچے کی شہادت کو صرف ایک تاریخی سانحہ نہیں سمجھتا بلکہ ظلم کے خلاف سب سے بڑی گواہی قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کربلا میں اے علی اصغرؑ ترا اعلانِ جنگ
حشر تک لیتا رہے گا ظلم سے تاوان جنگ

یہاں "اعلانِ جنگ" محض تلوار کی جنگ نہیں بلکہ ظلم کے خلاف حق کی اخلاقی مزاحمت کا استعارہ ہے۔ شاعر اس معصوم شہادت کو تاریخ کے سب سے طاقتور احتجاج میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اسی نظم میں آگے فرماتے ہیں:

تیر کھایا خوں بہایا مسکرایا جان دی
باپ کے دو ہاتھ بس تیرے لیے میدانِ جنگ (4)

ان اشعار میں قاصر نے حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کو خاندانی المیے کے بجائے حق و صداقت کی اجتماعی جدوجہد کا استعارہ بنایا ہے۔ یہاں باپ کی بے بسی بھی ہے، مگر اس بے بسی میں شکست نہیں بلکہ ایمان کی قوت پوشیدہ ہے۔ غلام محمد قاصر کے سلامیہ کلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذباتی وابستگی کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی بھی موجود ہے۔ ان کا سلام صرف مرثیہ خوانی نہیں بلکہ اہلِ بیتؑ کی تعلیمات کا عصری اظہار ہے، وہ لکھتے ہیں:

سایہ تیغ میں دشمن کو دعائیں دیں گے
جن کا معیارِ نظر اسوہ شبیر ہوا(5)

یہ شعر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ظلم خواہ کسی بھی دور میں ہو، اس کا انجام ہمیشہ عدل کے سامنے شکست ہے۔ شاعر حضرت علیؑ کی تلوار کو محض عسکری قوت کے طور پر نہیں بلکہ عدل، شجاعت اور حق کے استعارے کے طور پر پیش کرتا ہے، اسی سلام میں ایک اور مقام پر شاعر کہتا ہے:

سارے مظلوموں کی آہیں تجھ کہ ڈھونڈتی ہیں
دنیا والے چھینتے ہیں جب خوابوں سے تعبیر

یہ شعر کربلا کی پوری تاریخ کو دو مصرعوں میں سمو دیتا ہے۔ ایک طرف حق ہے جو ظاہری وسائل سے محروم ہے، دوسری طرف باطل ہے جو طاقت کا نمائندہ ہے، مگر تاریخ نے ثابت کیا کہ حقیقی فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔

عقیل عباس جعفری کے مطابق:

غلام محمد قاصر نے کربلا کو ماضی کے بجائے حال کی حقیقت بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار ہر دور کے انسان کے لیے نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔(7)

قاصر کے یہاں فرات بھی صرف ایک دریا نہیں بلکہ اختیار، اقتدار اور وسائل کی علامت ہے، جبکہ پیاس انسانی وقار اور اصول پسندی کی علامت ہے۔

غلام محمد قاصر کے کلام میں حضرت عباسؑ کا کردار صرف ایک بہادر سپاہی کا نہیں بلکہ وفاداری، ایثار اور امانت کی علامت ہے۔ حضرت عباسؑ کا ذکر کرتے ہوئے شاعر صرف علم اور شجاعت کی بات نہیں کرتا بلکہ ان کے کردار کی اخلاقی عظمت کو نمایاں کرتا ہے۔ ان

کے نزدیک وفا صرف ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے، اور حضرت عباسؑ اس نظریے کی کامل تصویر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں علم، دریا، فرات اہم علامتی معنوں میں سامنے آتے ہیں۔ ان استعاروں کے ذریعے شاعر انسانی ذمہ داری، ایثار اور خدمتِ خلق کا تصور پیش کرتا ہے۔

صبیح رحمانی تحریر کرتے ہیں:

غلام محمد قاصر کے یہاں اہلِ بیتؑ کے تمام کردار انسانی اقدار کی علامت بن جاتے ہیں، اس لیے ان کی تقدیسی شاعری صرف مذہبی شاعری نہیں بلکہ اخلاقی وادب بھی ہے۔ (8)

غلام محمد قاصر کی مشہور نظم "تضاد" ان کی فکری بصیرت کا اہم مظہر ہے۔ اگرچہ یہ نظم براہِ راست مرثیہ نہیں، لیکن اس کا پورا علامتی نظام واقعۂ کربلا سے مربوط ہے۔

یزید نقشہ جور و جفا بناتا ہے
حسین اس میں خط کربلا بناتا ہے

یزید موسم عصیاں کا لاعلاج مرض
حسین خاک سے خاک شفا بناتا ہے

یزید کا رخ کثافت کی ڈولتی بنیاد
حسین حُسن کی حیرت سرا بناتا ہے

یزید تیز ہواؤں سے جوڑ توڑ میں گم
حسین سر پر بہن کے ردا بناتا ہے

یزید لکھتا ہے تاریکیوں کو خط دن بھر
حسین شام سے پہلے دیا بناتا ہے

یزید آج بھی بنتے ہیں لوگ کوشش سے
حسین خود نہیں بنتا خدا بناتا ہے(9)

شاعر حق و باطل، روشنی اور اندھیرے، زندگی اور موت کے تضادات کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے کربلا ہر زمانے میں نئے روپ کے ساتھ موجود ہے

غلام محمد قاصر کی تقدیسی شاعری کا ایک اہم وصف ان کی علامت نگاری ہے۔

ان کے ہاں پیاس صرف تشنگی نہیں بلکہ عدل کی طلب ہے۔ فرات صرف دریا نہیں بلکہ اقتدار کی علامت ہے۔ خیمہ صرف رہائش نہیں بلکہ اہلِ حق کی تہذیب ہے۔ علم صرف پرچم نہیں بلکہ وفا کا نشان ہے۔ لہو صرف قربانی نہیں بلکہ حیاتِ نو کی بشارت ہے۔ سجدہ صرف عبادت نہیں بلکہ آزادیِ انسان کا استعارہ ہے۔

غلام محمد قاصر کی تقدیسی شاعری کا سب سے نمایاں وصف اس کی فکری گہرائی اور اسلوبی انفرادیت ہے۔ انہوں نے مرثیہ، سلام اور منقبت کی کلاسیکی روایت سے وابستگی برقرار رکھتے ہوئے جدید اردو شاعری کی علامتی، استعاراتی اور تہہ دار زبان کو بھی کامیابی سے برتا ہے۔ یہی امتزاج ان کی شاعری کو محض مذہبی عقیدت کا اظہار نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے

جدید انسان کے فکری مکالمے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ان کی شاعری میں بیان کی سادگی اور معنی کی وسعت ساتھ ساتھ چلتی ہے۔بظاہر ایک سادہ مصرع کئی تہوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ قاری جتنا اس پر غور کرتا ہے، اتنے ہی نئے معنی سامنے آتے ہیں۔یہی وصف اعلیٰ شاعری کی پہچان ہے۔غلام محمد قاصر کی رثائی شاعری میں "شعری لطافت اور فکری آگہی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

غلام محمد قاصر کی رثائی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ روایت سے وابستہ رہتے ہوئے بھی تقلید کا شکار نہیں ہوتے۔ان کے سلام اور مناقب میں میر انیس اور مرزا دبیر کی روایت کا احترام موجود ہے، لیکن ان کی زبان، علامتیں اور شعری فضا مکمل طور پر جدید ہے۔وہ واقعۂ کربلا کو محض ماضی کی یاد نہیں بناتے بلکہ اسے موجودہ عہد کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی صورتِ حال سے جوڑ دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہر دور کے قاری کے لیے معنی خیز بن جاتی ہے۔غلام محمد قاصر کی رثائی شاعری کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کے ہاں اہلِ بیتؑ کی محبت جذباتی وابستگی کے بجائے فکری وابستگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ان کی شاعری میں رثا صرف گریہ نہیں بلکہ شعور کی بیداری غلام محمد قاصر کی تقدیسی شاعری قاری کو صرف متاثر نہیں کرتی بلکہ اسے اپنے عہد کے اخلاقی سوالات پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔

غلام محمد قاصر کی رثائی شاعری کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انہوں نے اردو کے تقدیسی ادب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ان کے ہاں عقیدت، شعور، جمالیات اور فکری بصیرت ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ ان کی شاعری محض مذہبی اظہار نہیں رہتی بلکہ انسانی آزادی، عدل اور وقار کی عالمی آواز بن جاتی ہے۔

کہیں شجاعت، کہیں سخاوت، کہیں عدالت
سبھی حوالے اسی امامت کے نام آئے(10)

جو پیاس وسعت میں بے کراں ہے سلام اُس پر
فرات جس کی طرف رواں ہے سلام اُس پر(11)

غلام محمد قاصر کا شعری اسلوب اپنی ایک خاص جاذبیت اور دل کشی رکھتا ہے۔ اس میں شاعرانہ لطافت کے ساتھ گہرے ادراک کا عصر بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاصر کی شاعری صرف ہمیں سننے سنانے کے لطف سے بہرہ مند نہیں کرتی، بلکہ سوچنے اور سمجھنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔

حوالہ جات:

1۔ غلام محمد قاصر، سر شاخ یقیں، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اگست 2012، صفحہ 84
2۔ عقیل عباس جعفری، سانحہ کربلا کا استعارہ اور غلام محمد قاصر کی غزل، مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی اپریل تا جون 2022، صفحہ 259
3۔ غلام محمد قاصر، سر شاخ یقیں، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اگست 2021، صفحہ 64
4۔ ایضا صفحہ نمبر 64
5۔ ایضا صفحہ نمبر 82
6۔ ایضا صفحہ نمبر 84
7۔ عقیل عباس جعفری، سانحہ کربلا کا استعارہ اور گلام محمد قاصر کی غزل، مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی اپریل تا جون 2022، صفحہ 259

8۔ صبیح رحمانی، غلام محمد قاصر کی غزل، مشمولہ رنگ ادب غلام محمد قاصر نمبر، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی اپریل تا جون 2022، صفحہ 286
9۔ غلام محمد قاصر، سرشاخ یقیں، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اگست 2021، صفحہ 67
10۔ ایضاً صفحہ نمبر 59
11۔ ایضاً صفحہ نمبر 69

سمیہ زیب
پی ایچ ڈی ری سرچ سکالر، شعبہ اردو، جامعہ ہزارہ مانسہرہ، پاکستان

غلام محمد قاصر کی شاعری میں جمالیاتی عناصر

ملخص:

علمِ جمالیات (Aesthetics) دراصل حُسن، ذوق، احساسِ لطیف اور فنکارانہ تخلیق کی باطنی و ظاہری ہیئت کے سائنسی و فلسفیانہ مطالعے کا نام ہے۔ اردو ادب کی تاریخی روایت میں جمالیات کا تصور محض شے کے ظاہری حسّی جمال تک محدود نہیں رہا، بلکہ یہ روح کی پاکیزگی، کائناتی ہم آہنگی اور انسان کے داخلی وجدان کا مظہر بن کر ابھرا ہے۔ جدید اردو غزل کے منظر نامے پر غلام محمد قاصر ایک ایسی باوقار، شگفتہ اور صاحبِ اسلوب شخصیت کے طور پر ابھرے جن کی شاعری نے اپنے دور کے جید ترین ناقدین اور معاصر شعراء کو تحسین پر مجبور کیا۔ قاصر نے کلاسیکی روایت کے احترام کو قائم رکھتے ہوئے لسانی تشکیل اور فکر و خیال میں جو ندرت پیدا کی، اس نے معاصر اردو غزل کو جمود سے نکالا۔

ان کی شاعری میں موجود مابعد النفسیات، آگہی، اور ماورائی عناصر یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا وجدان حسی سرحدوں سے پرے کائناتی وسعتوں کا مشاہدہ کرتا تھا۔ ان کی شاعری میں امن کی تڑپ، انسان دوستی، اور اساطیری رنگ نے ان کے کلام کو ہمہ گیر آفاقیت عطا کی۔

کلیدی الفاظ:

جمالیات، اردو شاعری، غلام محمد قاصر، مابعد النفسیات، پیراسائکالوجی، پیکر تراشی، کربلائی استعارے، ترفع۔

جمالیات Aesthetics کا لفظ یونانی زبان کے لفظ 'Aisthesis' سے ماخوذ ہے جس کے معنی حسّی ادراک، شعور اور خوبصورتی کے احساس کے ہیں۔

فلسفیانہ نگاہ میں:

جمالیات وہ علم ہے جو حسن کی ماہیت، فنونِ لطیفہ کی قدر و قیمت اور انسانی جذبات و احساسات پر خوبصورتی کے اثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔

حواس کے ذریعے حسن و دلکشی سے متعلق مشاہدے میں آنے والی اشیا، حسین اشیا کی اصل یا حسین اشیا سے حاصل ہونے والی مسرت و شادمانی اور زندگی میں حسن و دلکشی کی افادیت ظاہر کرنے والے علم و فلسفہ کو" جمالیات" کہتے ہیں۔

حسن و دلکشی، خوبی و عمدگی، نظم و ترتیب اور تہذیب و شائستگی جو جزوی یا کلی طور پر، اشیا کے مشاہدے سے حواس کو متاثر کریں اور ان کے جزوی و کلی تاثر سے ناظر یا سامع پر فرحت و انبساط کے جذبات طاری ہوں، اس کو" جمال" کہتے ہیں۔ عرف عام میں ہم جس چیز کو" جمال" ، حسن، خوبصورتی کہتے ہیں اسی خوبصورتی کے احساس و ادراک کی مجموعی کیفیت اور اس سے متعلق علم و فلسفہ کو" جمالیات" کہا جاتا ہے۔ جمالیات، حسن اور فلسفۂ حسن بیان کرنے اور اس سے مسرت و شادمانی حاصل کرنے کا نام ہے" ۔

مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں:

جس انگریزی لفظ (Aesthetics) کے جواب میں یہ اردو لفظ (جمالیات) گڑھا گیا ہے، اس کا یہ صحیح مترادف نہیں ہے۔ انگریزی زبان میں Aesthetics، جمالیات سے کہیں زیادہ جامع اور بلیغ ہے۔ Aesthetics کے لغوی معنٰی ہر اس چیز کے ہیں جس کا تعلق حِس یا حِس لطیف سے ہو۔ اس اعتبار سے اگر اردو میں ترجمہ کیا جائے تو Aesthetics کے لیے " حِسّیات " یا " وجدانیات " یا " ذوقیات " بہتریں اصطلاح ہو۔ Aesthetics کا موضوع حسن اور فنونِ لطیفہ ہے۔(۱)

مجنوں گورکھ پوری نے حسن اور فن کاری کے فلسفے کو جمالیات کا نام دیا ہے۔ تمام حسی وادراکی کیفیات اور اشیاء، جو حسن وجمال اور دلکشی ورعنائی کی مظہر ہوں، وہ جمالیات کے زمرے میں آتی ہیں۔ جمالیات ایک وصف ہے، جس سے موصوف ہونے والی اشیا بے شمار ہیں۔ مثلاً: علم ودانائی، اخلاقِ حسنہ، دولت وثروت کا درست ومتوازن استعمال، فکر وفن، شعر وسخن، فنونِ لطیفہ، انسان کے موزوں ومتناسب اعضا، حسین چہرہ، حسین طرزِ گفتار و کردار، خوب صورت اعمال واشغال، حسین قدرتی مناظر، وغیرہ۔ جس طرح وصف کا اپنا کوئی مستقلاً وجود نہیں ہوتا، اسی طرح جمالیات کا فی نفسہ کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ جب بھی پائی جائے گی، کسی حقیقتِ ثابتہ کے ضمن میں پائی جائے گی۔ حسن وجمال جہاں اور جس چیز سے متعلق ہوگی، جمالیات بھی اس کے ارد گرد یا اس کے اندر پائی جائے گی۔

فنونِ لطیفہ کے علاوہ جمالیات کہیں بھی اپنا جلوہ دکھا سکتی ہے، لیکن اس کا نظارہ کرنے کے لیے ذوق آشنا نظر اور بلاغت آشنا فکر چاہیے۔ جمالیات کا تعلق شعر وادب سے ایسا ہی ہے جیسے روح کا تعلق جسم سے۔ مشہور مفکر " سارتر " نے شاعری کو فنونِ لطیفہ یعنی مصوری، موسیقی اور سنگ تراشی کی مانند قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان فنونِ لطیفہ کا صرف

ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے: تفریحِ طبع، لطف اندوزی اور فرحت وانبساط کا حصول۔ انسان گانا سن کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ موسیقی کی راگ اور سریلی آواز سے حظ اٹھاتا ہے۔ خوب صورت عمارت یا مجسمہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ انسان کے کانوں میں دل سوز اور خوبصورت اشعار جب رس گھولتے ہیں تو وہ مچل اٹھتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان فنونِ لطیفہ میں ایک غیر مرئی مقناطیسی کشش ہے، جو انسان کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور اپنا والہ وشیدا بناتی ہے۔ فنونِ لطیفہ میں موجود اس غیر مرئی مقناطیسی کشش کو ''حسن کاری'' کہتے ہیں، جس کو ادب کی اصطلاح میں ''جمالیات'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اظہارِ حسن اور حصولِ انبساط، فنونِ لطیفہ کا بنیادی مقصد ہے۔ شاعری بھی ایک حسنِ مجسم ہے۔ جمالیات کی تفہیم اور اس کے شعور وادراک کے لیے گہرا علم، وسیع مطالعہ اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے شعر وادب میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ ایک متن یا نفس مضمون اور دوسرا طرزِ بیان۔ شاعری و نثر نگاری میں حسنِ معنیٰ کو جتنی اہمیت حاصل ہے، اتنی ہی اہمیت حسنِ صورت کو بھی حاصل ہے۔ جمالیات کا عمل دخل صرف ظاہری شکل و صورت تک محدود نہیں، بلکہ معنوی صورت سے بھی یہ سروکار رکھتی ہے۔ اسی لیے افلاطون نے صدیوں پہلے یہ کہہ کر کہ علوم و فنون اور اعمال و قوانین بھی جمالیات سے آراستہ ہوتے ہیں، اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ ہیئت یا ظاہری صورت حسن یا جمالیات نہیں، بلکہ جو چیز پیش کی جارہی ہے، اس کے موضوع میں بھی حسن وجمال کی رمز شامل ہونی چاہئے۔

میر تقی میر کے ہاں جمالیات ایسی لطیف لہر سے عبارت ہے جو انسان کے داخلی وجود کو چھو لیتی ہے۔ ان کے ہاں حسن کی نفاست اور نازکی کا احساس بے مثال ہے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے (۲)

مرزا اسد اللہ خان غالب کے ہاں جمالیات کا تصور محض بصری یا حسّی نہیں بلکہ شدید فکری، تحیّری اور فلسفیانہ ہے۔ غالب حسن کو ایک متحرک اور خود کو ظاہر کرنے والی کائناتی قوت کے طور پر دیکھتے ہیں:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (۳)

مومن خان مومن کی جمالیات معاملاتی حسن، نزاکت اور نفسیاتی باریک بینی پر مبنی ہے، جہاں محبوب کی موجودگی اور عدم موجودگی کے احساس کو نہایت دلکش صوتی ترنم میں ڈھالا گیا ہے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جدید اردو شاعری میں جمالیاتی اقدار کے حوالے سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال نے اردو شاعری کو جمالیات کا ایک نیا عظیم اور خودی پر مبنی تصور عطا کیا۔ اقبال کے ہاں حسن وہ ہے جو انسان میں عمل، حرکت اور تخلیقی توانائی بیدار کرے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود (۴)

بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک نے جمالیات کو سماجی حقیقت نگاری اور جدوجہد سے جوڑا، جبکہ جدیدیت کی لہر نے فرد کی تنہائی، باطنی شکست وریخت اور استعاراتی ندرت کو جمالیاتی تجربہ بنایا۔ اسی تناظر میں ستر کی دہائی کے بعد جو شعری منظر نامہ ابھرا، اس میں غلام محمد قاصر کا نام ایک منفرد جمالیاتی آواز کے طور پر سامنے آتا ہے۔

بیسویں صدی کے اواخر میں جدید اردو غزل کے منظر نامے پر ابھرنے والے شعرا میں غلام محمد قاصر ایک ایسے غیر معمولی شاعر ہیں جنھوں نے غزل کی کلاسیکی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اسے نئے استعاروں، اچھوتی تراکیب اور مابعد الطبیعیاتی ابعاد سے روشناس کرایا۔ خیبر پختون خوا سے تعلق رکھنے والے اس ممتاز شاعر، ڈراما نگار اور نقاد کی مادری زبان اگرچہ اردو نہیں تھی، لیکن انہوں نے اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے اردو ادب کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔

قاصر نے اپنے عہد میں مروجہ ادبی تحریکوں، خواہ وہ ترقی پسند تحریک کے معاشی و نظریاتی رویے ہوں یا جدیدیت کے ابہام پسند رجحانات سے شعوری طور پر فاصلہ برقرار رکھا۔ ان کا جمالیاتی وژن کسی وقتی نظریے کی زنجیروں میں جکڑے جانے کے بجائے انسانی نفسیات کی اتھاہ گہرائیوں، کائناتی سچائیوں اور داخلی و خارجی کائنات کے متوازن رشتوں پر استوار ہے۔

غلام محمد قاصر کے کلام میں حسن کا تصور مادی دنیا کی حدود سے تجاوز کر کے ایک کائناتی تقدس حاصل کر لیتا ہے:

چاند ہے کہ سورج ہے فیصلہ نہیں ہوتا
نیل گوں دوپٹے سے روشنی سی چھنتی ہے
تیری یاد کا پرتو، چاندنی چراغ اور دل

کس قدر اجالوں سے ایک رات بنتی ہے (۵)

قاصر الفاظ اور معانی کے مابین نئے حسّی رشتے استوار کرتے ہیں، جس کے ذریعے وہ وجود کے باطن اور کائنات کے ظاہر کے مابین ایک حسین توازن پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں ان کے نزدیک محبوب کا حسن مادی زمین کے بجائے ستاروں کی کہکشاں سے منسوب ہے، جو ان کے کائناتی اور تخیلاتی نظریۂ حسن کی ایک واضح مثال ہے:

اسی لیے تو زمیں پر وہ اجنبی نہ لگے
میں ان سے پہلے ملا تھا کسی ستارے پر (٦)

غلام محمد قاصر کی شاعری کا ایک نہایت منفرد اور اچھوتا پہلو ان کا مابعد النفسیات اور مابعد الطبیعیاتی موضوعات سے گہرا شغف ہے۔ وہ زمان و مکان کی مروجہ مادی قیود سے آزاد ہو کر غیبی اشاروں، پراسرار روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کی دنیاؤں کی تخلیقی سیر کرتے ہیں۔

ان کی غزلوں میں ابتدا ہی سے ایک پراسرار اور ماورائی فضا محسوس ہوتی ہے، جو ان کے تیسرے شعری مجموعے "دریائے گمان" میں انتہائی ارتقائی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کی مابعد النفسیاتی کیفیات کا اظہار دیکھیے:

وہ بے دلی میں کبھی ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں
تو ہم بھی سیر سماوات چھوڑ دیتے ہیں (۷)

انسانی ذات کا کائناتی پھیلاؤ اور اپنے اندر پوری کائنات کو جذب کر لینے کا یہ پیراسائکالوجیکل رویہ ان کے اس شعر میں مزید نکھر کر سامنے آتا ہے:

پہلے اک شخص میری ذات بنا
اور پھر پوری کائنات بنا (۸)

ان رویوں کی بدولت ان کے ہاں جسمانی ملاپ کے پیچھے چھپی ان دیکھی مجبوریاں اور چار گھروں کی مادی دوری کے باوجود دشت جیسی نفسیاتی مسافتوں کا احساس ایک دلکش جمالیاتی واردات بن جاتا ہے:

ملنے کی ہر آس کے پیچھے ان دیکھی مجبوری تھی
راہ میں دشت نہیں پڑتا تھا چار گھروں کی دوری تھی(۹)

غلام محمد قاصر کی شاعری میں مذہبی اور عقیدت مندانہ عناصر روایتی اور خشک واعظانہ انداز کے بجائے انتہائی قلبی، روحانی اور سرشاری کی کیفیات سے لبریز ہیں۔ ان کا تقدیسی کلام "سرِ شاخِ یقین" عقیدت و محبت کی انہی دلی وارداتوں کا عکاس ہے، جہاں وہ نعت کے روایتی اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس میں گہرے فکری زاویے لاتے ہیں۔

اسی طرح انہوں نے اردو غزل اور نظم میں سانحۂ کربلا اور تلمیحاتی نظام کو ایک لافانی اخلاقی اور حسّی حسن کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک امام حسینؓ کا کردار ظلم کے خلاف محض ایک جنگ نہیں، بلکہ وہ حسنِ لازوال اور نورِ الٰہی کی وہ حیرت سرا ہے جو تاریکیوں کو روشنی میں تبدیل کرتی ہے۔ ان کا مشہور سلام "تضاد" دیکھیے:

یزید، نقشۂ جور و جفا بناتا ہے
حسینؑ اس میں خطِ کربلا بناتا ہے
یزید کاخِ کثافت کی ڈولتی بنیاد
حسینؑ حسن کی حیرت سرا بناتا ہے
یزید لکھتا ہے تاریکیوں کو خط دن بھر
حسینؑ شام سے پہلے دیا بناتا ہے

یزید تیز ہواؤں سے جوڑ توڑ میں گم
حسینؑ سر پہ بہن کے ردا بناتا ہے(۱۰)

لفظ کی تازگی، کلام میں نگینہ جڑنے کا کام کرتی ہے۔ ثقیل الفاظ اور بھاری بھر کم کلمات کو تازہ سمجھ کر شعر میں برتنا، ریشمی لباس میں ٹاٹ کا پیوند جوڑنے کے مترادف ہے۔ بھرتی کا لفظ، شعر کو سست اور اس کے حسن کو متاثر کرتا ہے غلام محمد قاصر کے شعری اسلوب میں وضاحت و قطعیت، سادگی و پرکاری، پاکیزگی و نادرہ کاری، صفائی و برجستگی، رنگینی دل کشی اور لسانی چاشنی پائی جاتی ہے اور یہ چیزیں '' شعری جمالیات '' کے لازمی اجزا ہیں۔ ذیل کے اشعار میں شعری جمالیات کے یہ سارے اسالیب موجود ہیں۔:

نظر نظر میں ادائے جمال رکھتے تھے
ہم ایک شخص کا کتنا خیال رکھتے تھے(۱۱)

خطا نہیں جو کھلے پھول راہ صرصر میں
یہ جرم ہے کہ وہ فکر مآل رکھتے تھے(12)

مشرقی اور بالخصوص اسلامی اور اردو روایات میں جمالیات کا تعلق صرف ظاہری حسن و تناسب سے نہیں بلکہ ذاتِ باری تعالیٰ کے حسنِ مطلق، باطنی تزکیہ اور روحانی سرشاری سے قائم رہا ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ کا عمیق مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ہماری شعری روایت ابتدا ہی سے جمالیاتی احساس سے لبریز رہی ہے۔ کلاسیکی غزل گو شعرا نے حسن و عشق کے معاملے کو محض مادی یا جسمانی حدود تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے آفاقی و روحانی معنویت عطا کی ہے۔

غلام محمد قاصر نے کلاسیکی زبان کا دامن تھامے رکھتے ہوئے اس میں ندرت اور شگفتگی پیدا کی۔ ان کا صوتی نظام اور بحروں کا انتخاب رہگزر پر پائل کی طرح بجتا محسوس ہوتا ہے۔

ان کے ہاں پیکر تراشی کی مادی حسیت اتنی تیز ہے کہ وہ خوشبو کو تصویر کے فریم میں لانے اور چاندنی کو صلیب پر لٹکانے جیسے اچھوتے بصری تجربات کامیابی سے تخلیق کرتے ہیں:

خوشبو گرفتِ عکس میں لایا اور اس کے بعد
میں دیکھتا رہا تری تصویر تھک گئی (۱۳)

میں نے پڑھا تھا چاند کو انجیل کی طرح
اور چاندنی صلیب پر آکر لٹک گئی (۱۴)

تخیل، شاعری کی جان ہے۔ نظم کو نثر پر جو تفوق و برتری حاصل ہے، اس کی ایک بنیادی وجہ شاعری کا وہ تخیلاتی نظام ہے، جو انسان کو خاک نشیں ہو کر بھی عرش نشیں بنا دیتا ہے اور زمین پر بیٹھے بیٹھے ہفت افلاک کی سیر کرا دیتا ہے۔ ''تخیل و محاکات'' کو جسمِ شاعری کے لیے ریڑھ کی ہڈی تسلیم کیا جاتا ہے۔ شاعر کا تخیل جتنا بلند ہوتا ہے، اس کی شاعری اتنی ہی بلند اور کامیاب سمجھی جاتی ہے۔ لیکن تخیل کو حقیقت کے قریب ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ رہوارِ تخیل اپنی سرعت اور برق رفتاری دکھانے کے چکر میں حقیقت و واقعیت کے دائرے سے باہر ہو جائے اور فرضی دنیا میں کھو جائے۔

غلام محمد قاصر کے کلام کی سب سے بڑی ادبی و جمالیاتی خصوصیت '' تخیل و مضمون آفرینی '' ہے۔ مضمون آفرینی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر روایتی مضامین میں نئے مطالب و مضامین بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو، قاصر کا شعری لہجہ منفرد بھی ہے اور مؤثر بھی۔ان کی شاعری میں روایت و درایت کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف روایتی شعری لہجہ اپنائے ہوئے تو دوسری جانب جدید طرزِ اظہار سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔ حقیقی، کامیاب اور جمالیات آفریں شاعری وہی کر سکتا ہے، جو زبان و ادب کا گہرا علم رکھتا ہو۔ علم بیان و عروض اور معانی و بدیع کے اصول و مبادی کا رمز آشنا ہو۔ قدیم اساتذۂ سخن کے دواوین و کلیات پر اس کی نظر گہری ہو، غلام محمد قاصر ادب و شاعری کے بحر بے کراں کے شناور تھے، عروض و رموز شاعری پر ان کی گہری نظر تھی، الفاظ کے در و بست، زبان کی چاشنی، لہجہ کی درستی اور جملے کی ترتیب پر ان کی نگاہ رہتی یہی وجہ ہے کہ قاصر کی شاعری اسلوب و معانی فکر و فن ہر دو پہلوؤں سے ترفع اور جمالیات کا مظہر ہے۔

جمالیات کا فنونِ لطیفہ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بلکہ فنونِ لطیفہ کا مقصد ہی ناظرین کو حسن و جمال کی قدروں سے آشنا کرنا اور ان کو مسرت و شادمانی سے ہمکنار کرنا ہے۔ فنونِ لطیفہ، محض حسین چیزوں کو پیش کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ چیزوں کو حسین پیرائے میں پیش کرنا ہی جمالیات ہے۔ قاصر نے اپنی شاعری میں اس کام کو بطریقِ احسن انجام دیا ہے۔ انہوں نے دور از کار خیالات اور پامال موضوعات کو بھی نہایت عمدگی سے جدت و ندرت کے رنگ میں سمو کر پیش کیا ہے۔

درد کو شکل نہ دے آہ کو تجسیم نہ کر
عقل کہتی ہے کسی ربط کو تسلیم نہ کر

چند شامیں جو لٹکتی رہیں دیوار کے ساتھ
وقت کہتا ہے انہیں شامل تقویم نہ کر (۱۵)

غلام محمد قاصر ایک قادر الکلام اور بلاغت آشنا شاعر تھے موضوع کی مناسبت سے کس طرح کے الفاظ لائے جائیں، قاصر اس تکنیک سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی شاعری کے جمالیاتی کینوس کا یہ رخ نہایت اہم اور قابل قدر ہے کہ وہ ہر جگہ الفاظ و معانی کے در وبست کا خاص خیال رکھتے ہیں موضوع یا مضمون کو ادا کرنے کے لیے کون سا لفظ اور کون سا اسلوب زیادہ مؤثر اور دل پذیر ہوگا، شاعری میں اس کا پاس و لحاظ بہر حال ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے قاصر اپنی قوتِ متخیّلہ کے سہارے جب نوع بہ نوع خیال ڈھونڈ کر لاتے ہیں تو اس کے لیے اس کے متناسب الفاظ بھی وضع کرتے ہیں تو ان کی شاعری ان دیکھی مسرت کی لہر کی صورت قاری کے دل دماغ میں انبساط پیدا کرتی ہے۔

مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

" قوتِ متخیّلہ جہاں خیالات میں باریکیاں پیدا کرتی ہے، وہاں الفاظ بھی ایسے الہامی اور اچھوتے ڈھونڈ کر لاتی ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قوتِ متخیّلہ کا تصرف جس قدر خیالات پر ہوتا ہے، اتنا ہی الفاظ پر بھی ہوتا ہے۔ حسنِ الفاظ کے متعلق کسی محقق کا قول ہے کہ لفظ بمنزلۂ قالب کے ہے اور معنٰی اس کی روح ہے۔ دونوں (لفظ و معنی) میں روح و قالب جیسا ارتباط ہے"۔ (۱۶)

غلام محمد قاصر کی شاعری کا تنقیدی جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا شعری کینوس محض عارضی رومانوی جذباتی پن یا روایتی سماجی نعرے بازی کا اسیر نہیں ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے باطنی تجربات، کائناتی سچائیوں، مابعد النفسیاتی مشاہدات اور سماجی

اداسیوں کو زبان کے روایتی حسن کے ساتھ اس طرح یکجا کیا کہ ان کی شاعری ایک سدا بہار سلیقہ بن کر اردو غزل کی آبرو بن گئی۔

اردو شاعری میں جمالیات کی جو شاندار روایت میر، غالب، مومن اور اقبال سے ہوتی ہوئی جدید دور تک پہنچی، غلام محمد قاصر نے اس میں مابعد النفسیاتی اور کائناتی تناظر شامل کر کے اسے ایک نئی بالیدگی اور دوام عطا کیا ہے۔

حوالہ جات

1. مجنوں گورکھپوری، تاریخ جمالیات، انجمن ترقی اردو (ہند) ی گڑھ صفحہ 12
2. میر تقی میر، کلیات غزلیات میر، مرتبہ داکٹر علی محمد خان، الفیصل لاہور، فروری 2013، صفحہ 648
3. مرزا اسد اللہ خان غالب، دیوان غالب، مرتبہ حامد علی خان، الفیصل، لاہور جنوری 2016، صفحہ 92
4. علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، اقبال اکیڈمی لاہور، 2021، صفحہ 418
5. غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اپریل 2018، صفحہ 197
6. ایضاً صفحہ 249
7. ایضاً صفحہ 340
8. ایضاً صفحہ 56
9. ایضاً صفحہ 305
10. غلام محمد قاصر، سر شاخ یقیں، رنگ ادب پبلیکیشنز کراچی، اگست 2021، صفحہ 67
11. غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، اپریل 2018، صفحہ 43
12. ایضاً صفحہ 95
13. مرزا واجد حسین، چراغ سخن، گلشن ابراہیمی، لکھنو، صفحہ 4

لاریب ارشاد

ریسرچ سکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج نمبر (1) مانسہرہ

غلام محمد قاصرؔ کی شاعری میں رجائی عناصر مجموعہ (آٹھواں آسماں بھی نیلا ہے) کے تناظر میں

تلخیص:

اردو شاعری انسانی جذبات ،احساسات کی ترجمان رہی ہے اس میں جہاں غم ، محرومی، شکست اور قنوطیت کے رنگ ملتے ہیں وہیں امید، یقین، حوصلہ اور تعمیر نو کا جذبہ بھی نمایاں نظر آتا ہے. رجائیت محض ایک موضوع نہیں ہے بلکہ ایک فکری اور جمالیاتی رویہ ہے۔ اردو شاعری میں یہ رویہ مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوا۔ کبھی تصوف کے اہم نکات بے ثباتی، فنا، تسلیم و رضا میں سامنے آیا تو کبھی زندگی کی خوبصورتی غمِ جاناں و غمِ دوراں کے امتزاج، محبت، خودداری و عزم، سماجی انصاف، انسانیت، عشق اور انسانی تجربات میں، کبھی طبقاتی ناانصافیوں، استحصال اور جبر کے خلاف آواز بلند کرنا، منصفانہ اور روشن مستقبل کا خیال پیش کرتے ہوئے سامنے آیا۔ بہر حال شاعری میں امید پرستی کا مقصد اقدار کو بہتر بنانا ہے۔ مختلف شعراء اپنے اپنے انداز میں سماجی تنزلی اور مایوسی کو عزم و حوصلے اور بہتر سوچ کے زریعے بدلنے کا پیغام دیتے ہیں۔

ستر کی دھائی میں ابھرنے والے ناموں میں ایک اہم نام غلام محمد قاصرؔ ہے جن کی شاعری ایک پر امید سوچ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کا شعری سرمایہ امید اور امکانات پر غیر متزلزل یقین کے گہرے احساس سے عبارت ہے ۔ اس تحقیق کا مدعا غلام محمد قاصر کی

شاعری میں امید پرستی کے مختلف عناصر کو دریافت کرنا اور یہ جانچنا ہے کہ یہ عناصر کس طرح ان کے کام کے منفرد جمالیاتی، فکری اور فلسفیانہ پہلوؤں میں متاثر کن اضافہ کرتے ہیں ۔ قاصر کی شاعری وقتی حدود سے ماورا ہو کر کامیابی، محبت سماجی شعور کی بیداری جیسے لازوال پیغامات پیش کرتی ہے ۔ ان تمام محرکات کو مرکز میں رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ قاصر کی شاعری نہ صرف ادبی سطح پر ابھرتی ہے بلکہ شعوری، نفسیاتی اور فلسفیانہ موقف بھی پیش کرتی ہے۔

کلیدی الفاظ:

شاعری، امید، ناامیدی، اردو، رجائیت، ادب، محبت، زندگی، معنوی پہلو، غزل، نظم

ادب انسانی جذبات، تجربات اور خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے جب کہ رجائیت انسانی فکر کا اہم پہلو ہے ۔ ہر انسان کے خیالات دیگر انسانوں سے مماثل ہونے کے ساتھ ساتھ کئ حوالوں سے منفرد خصائص کے حامل ہوتے ہیں۔ شاعری میں محبت زندگی، مابعد الطبیعیات، خوابوں کا تذکرہ، نفسیاتی شعور، انقلابی سوچ جیسے افکار اسے دیگر شعراء سے ممتاز کرتے ہیں۔ کلاسیکی اردو شاعری میں شعراء نے اپنے دور کے سیاسی و سماجی حالات کے زیر اثر ایسے اشعار کہے ہیں جن میں غم اور حزن کا پہلو حاوی ہے جس کی وجہ سے قنوطیت کلاسیکی شاعری میں نمایاں رجحان کے طور پر سامنے آئی۔ تاہم انیسویں صدی میں صوفیاء نے ادب کو ادب برائے زندگی کا زریعہ بنایا۔ صوفیاء سے جہاں نہاں خانہ دل اور دین و فکر روشن ہوئے وہیں زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت نے بھی خوب استفادہ کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادیبوں نے سماجی ناانصافی، طبقاتی تضادات اور استحصالی نظام کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے ایسے معاشرے کا تصور پیش کیا جو انصاف، برابری اور انسانی وقار پر مبنی ہو۔ اردو شاعری جب

بیسویں صدی (ستر کی دہائی) میں داخل ہوتی ہے تو غلام محمد قاصرؔ اہم حوالہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ غلام محمد قاصرؔ کی غزلوں اور نظموں میں رجائیت کے متنوع پہلوؤں کا تجزیہ کرنے سے پہلے رجائیت کے بنیادی مباحث سے آگاہی ضروری ہے۔

"انسانی جذبات کے ایسے رویے کو جو انسانی ذہن کو آرزو مندی، بلند خوصلگی اور بہتر کی جستجو کی طرف مائل کرے اور زندگی کو خوبصورت بنا کر پیش کرے رجائیت کہلاتا ہے"

(1) فیروز اللغات میں درج ذیل معنوں میں بیان کیا جاتا ہے:

"تصویر کا روشن پہلو دیکھنا"۔ "آرزو سے پر ہونا"۔ "اچھے خیال رکھنا"

(2) لغات نظامی اردو میں رجائیت کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

(3) "رجا (مونث) امید، آرزو، تمنا، خواہش۔"

یہ ادب اور تنقید کی ایک اصطلاح ہے اور ایک تخلیقی و فکری رجحان جس میں شاعر زندگی کی تلخیوں اور مسائل کو تسلیم کرتے ہوئے امید، یقین اور عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اندھی خوش فہمی نہیں بلکہ شعوری اور تعمیری طرز فکر ہے۔ ادب میں رجائیت کو قنوطیت کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ قنوطیت اگر یاس، ناامیدی، اور جمود کا محرک ہے تو رجائیت حوصلہ، امید، عزم کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ یوسف عزیز، امید و یقین کی حامل رجائیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ہم رجائیت اور قنوطیت کا باہم موازنہ کریں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک نظریہ زندگی کی فعالی قوتوں کا موید و مبلغ ہے اور دوسرا انفعالی شکستوں کو سینے سے چمٹائے رکھتا ہے۔ اگر ایک زندگی کو فاعلانہ صلاحیتوں حرکت و اختیار فکر و عمل کی تلقین کرتا ہے تو دوسرا یاس و ناامیدی شکست و ریخت افسردگی و غم ناکی بے یقینی و بے اعتمادی کو اپناتا ہے۔"(4)

ایک رجائیت فرد حرکت اور عمل پر یقین رکھتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کا درس دیتا ہے۔ دنیا کو محض مسائل کا مسکن تصور نہیں کرتا بلکہ حسن، دلکشی اور رعنائی کا شیرازہ ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں غلام محمد قاصرؔ اہم حوالہ بن کر سامنے آئے۔ یہاں ان کی شاعری میں رجائیت کے متنوع پہلوؤں کا تجزیہ "آٹھواں آسماں بھی نیلا ہے" کے تناظر میں کیا جارہا ہے۔ یہ عنوان خود علامتی طور پر ایسی امید کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو ظاہرا دسترس سے باہر ہے مگر اس کا وجود یہ یقین دلاتا ہے کہ نیلا پن یعنی سکون اور وسعت آخر کار انسان کی قسمت میں لکھا ہے۔

"A pessimist sees the difficulty in every opportunity an optimist sees the Opportunity in every diff difficulty(4)"

غلام محمد قاصرؔ بذات خود خود مثبت سوچ رکھنے والے انسان تھے جو کبھی کسی کا برا نہیں سوچتے تھے۔ نہایت مشکل حالات میں بھی کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ آپ کی شخصیت کے حوالے سے "شہاب صفدر" لکھتے ہیں:

"غلام محمد قاصرؔ کی شخصیت کا مرکزی نقطہ محبت ہے۔ وہ انسانیت اور فطرت سے پیار کرنے والے آدمی اور شاعر تھے۔ نہایت مشکل حالات میں مایوسی کا شکار نہیں ہوئے۔ مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے انہیں مثبت سوچ رکھنے والا ایک انسان پایا جو کبھی کسی کا برا نہیں سوچتا تھا۔ ان کی شخصیت کا عکس ان کے اشعار میں بھی ہے"(6)

یہ کوئی تخت و تاج نہیں ہے کہ چھوڑ دوں ؔ
سانسوں کا انحصار ہے تیرے خیال پر(8)

ماند پڑ جائے اگر شمع محبت تو نگاہ
چاند پر بھی تیری تصویر بنا آتی ہے(9)

قاصرؔ نے محبت کو اقتدار اور دنیاوی جاہ و جلال سے بلند تر قرار دیا ہے۔ تخت و تاج تو ترک کئے جا سکتے ہیں مگر محبوب کا خیال زندگی کی سانسوں سے جڑا ہے۔ محبوب کے خیال کو زندگی کے تسلسل کی علامت قرار دیتے ہیں۔ خیال، امید اور دوامِ محبت کی نمائندگی کرتے ہوئے تخیل کی قوت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اگر محبت کی شمع ماند پڑ جائے تب بھی نگاہ محبوب کو کائنات میں تلاش کر لیتی ہے۔ چاند پر تصویر بنانا ایک رومانوی اور علامتی پیکر ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سچی محبت فنا نہیں ہوتی۔

خوش ہوں کہ کسی کی محفل میں ارزاں تھی متاعِ بیداری
اب آنکھیں ہیں بے خواب تو کیا اب خواب ہیں بے تعبیر تو کیا(10)

ایک طنزیہ اور المیہ رنگ نمایاں ہوتا ہے کہ شعور اور آگہی کی قدر نہیں کی گئی۔ شاعر ناامید نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ اگر آنکھوں میں صرف نیند نہیں اور خواب تعبیر سے محروم ہیں تب بھی یہ مایوسی کا جواز نہیں بنتا "خوش ہوں" شاعر روتا نہیں بلکہ خوش ہے کہ اسے شعور کی دولت مل گئی۔ چاہے دنیا اسے ارزاں سمجھے لیکن شاعر کے لئے بیداری ہی سب سے بڑی دولت ہے۔

کے قاصرؔ کے ہاں محبت کے اشعار میں خاص رنگ اور فطری عمل ذریعے وابستگی کا اظہار ملتا ہے۔ انسان جب داخلی خوف یا یادوں کے بوجھ سے گھبرا جاتا ہے تو وہ مکمل طور پر ٹوٹ نہیں جاتا بلکہ فطری طور پر کسی سہارے، تعلق یا وسیلے کو تلاش کرتا ہے۔ یہ تلاش اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر بقاء اور توازن کو برقرار رکھنے کی خواہش موجود ہے۔''

زندگی جب تیری یاد سے گھبراتی ہے
پیڑ سے ایک امر بیل لپٹ جاتی ہے (11)

1988ء سے قبل ملک میں طویل فوجی دور (ضیاء الحق) کا خاتمہ ہوا۔ یہ دور جمہوری حکومت کے تعطل پھر اس کی بحالی کے جدوجہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ ملک میں شدید سیاسی انتشار اور بے یقینی عام تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا خاتمہ کر کے ضیاء الحق نے تیسرا مارشل لاء قائم کیا۔ تاہم 1988ء کا سال دوبارہ جمہوری عمل کی نوید لے کر آتا ہے۔ سویت یونین کی افغانستان میں مداخلت کے باعث خیبر پختونخوا میں مہاجرین کی آمد اور منشیات کی سمگلنگ جیسے عوامل نے سماجی ڈھانچے کو بری طرح متاثر کیا۔

غلام محمد قاصرؔ "پروفیسر نذیر تبسمؔ" کے ساتھ انٹرویو میں اس مجموعے کے منظر عام پر آنے کے متعلق کہتے ہیں:

یہ تقریباً اس کے گیارہ سال بعد 1988ء میں، اور آپ اس سے سوئے اتفاق کہہ لیں کہ وہ جو دور تھا ناسیاہ اور جسے آپ کہتے ہیں وہ پورے ان گیارہ سال پر محیط ہے اور اس میں اگر آپ غور کریں تو نظمیں ہیں یا غزلیں ہیں ان میں ایک تاریخ چھپی ہوئی ہے وہ بھی آپ کو نظر آئے گا (12)

غلام محمد قاصرؔ نے بیشتر غزلیں اور نظمیں اسی دور میں تحریر کی ہیں۔ "زندگی", "خواہشوں کی طرح", "اندیشوں میں ڈوبی خبر" اسی دور میں تخلیق کی گئیں۔

قاصرؔ اپنی غزلیہ اشعار میں ایسے عہد کی تصویر پیش کرتے ہیں جہاں خواہشات کے مسافر اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اجتماعی سطح پر روشنی کے امکانات مدھم پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

"خواہش کے مسافر تو اب تاریکی جاں میں چلتے ہیں
اِک دل کے نہاں خانے میں کہیں جلتی ہے شمع ضمیر تو کیا"(13)

شاعر کے ہاں اگرچہ مجموعی فضا تاریک ہو چکی ہے مگر ایک ہلکا سا چراغ جل رہا ہے۔ اس کی روشنی بظاہر کمزور ہے لیکن بذات خود اس کا وجود امید کی علامت ہے۔ قاصرؔ کے تمام اشعار میں رجائیت کی نوعیت کہیں مدھم، کہیں پر جوش، کہیں مزاحمتی ہے ایسی امید نہیں جو حالات سے بے نیاز ہو۔ بلکہ وہ ہے جو تاریکی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے خلاف ایک داخلی مزاحمت کے طور پر قائم رہتی ہے یہی انداز قاصر کو محض مایوسی سے نکال کر ایک سنجیدہ اور فکری سطح پر استوار کرتا ہے

ستّر کی دہائی کے بعد غزل کے ساتھ ساتھ اردو نظم میں بھی رجائیت کی ایک نئی لہر نظر آتی ہے۔ جو بنیادی طور پر 1971ء کے المیے (سقوطِ ڈھاکہ) اور اس کے بعد کے سیاسی، سماجی بحران کے ردِ عمل میں پیدا ہوئی۔ اس دور میں نظم نے جہاں داخلیت، علامت نگاری اور تجریدیت کا سہارہ لیا وہیں شدید یاسیت کے درمیان حالات بدلنے اور بقائے باہمی کی رجائیت بھی پیش کی۔

ڈاکٹر ناز بیگم "ماہنامہ آج کل" میں لکھتی ہیں:

"I can't change the direction of the wind but I can adjust my sail to always reach my destination14"

غلام محمد قاصرؔ کا شمار ستر کی دہائی میں سامنے آنے والے ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے شاعری کو ایک نئے انداز سے روشن کیا آغاز میں اگرچہ انہوں نے نظموں کی

روایت کی پاسداری کی مگر بعد ازاں جدید نظم کی طرف بھی راغب ہوئے اور عصری موضوعات کو اعتماد کے ساتھ اظہار کا وسیلہ بنایا۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں قاصرؔ نے زندگی کے کٹھن دن گزارے۔ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ حالات کے ہاتھوں ہار کر بیٹھ جاتا مگر قاصر نے ہمت نہ ہاری کیوں کہ ان کا ذہن انہیں اچھے دنوں کی امید دلاتا رہا۔اس حوالے سے نظم "زندگی" ملاحظہ ہو:

زندگی

''دور تک پھیلی ہوئی پگڈنڈیوں پر
دھوپ کے پیوند ہیں
سر پہ اِک بھیدوں بھری گٹھڑی اٹھائے
ایک بڑھیا، ایک مجبورِ سفر بڑھیا
جلتے تلوؤں کے کھجانے کو بھی جھک سکتی نہیں
چل رہی ہے یوں کہ رک سکتی نہیں" (15)

قاصرؔ کی اس نظم میں ہر انسان اپنی تھکن بھی دیکھتا ہے اور اپنی امید بھی، کیوں کہ وہ یہ نہیں کہتا کہ راستہ آسان ہے۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ راستہ ختم نہیں ہوا۔جب تک سانس ہے چلنا ہے۔یہ زندگی کا سچا سبق ہے۔

آٹھواں آسماں بھی نیلا ہے سائنس اور مذہب میں سات آسمانوں کا تصور تو ہے مگر آٹھویں آسمان کا نہیں۔آٹھواں آسماں اس ان دیکھی امید کا نام ہے جو انسان کے پاس ہے۔ امید اس آٹھویں آسماں کی مانند ہے جس کا وجود تو نہیں ہے مگر یقین ہے کہ شاید ہو یا پھر شاید نہ ہو۔امید بھی اس ہونے اور نہ ہونے کے درمیان جھولتی ہوئی ایک کیفیت کی عکاس ہے۔ جب انسان ہونے یا نہ ہونے کی کشمکش میں ڈگمگا بھی جاتا ہے مگر ہمت و حوصلے کی قوت اسے

یقین کی منزل عطا کر ہی دیتی ہے۔اس عنوان کے تحت قاصرؔ نے ایک نظم "آٹھواں آسماں" لکھی ہے۔

آٹھواں آسماں

شاید اپنا سراغ مل جائے
اِک قیامت زدہ سی غار کے بیچ
اپنا ہی گمشدہ قبیلہ ہے
آٹھواں آسماں بھی نیلا ہے(16)

یہ قاصرؔ کی وہ نظم ہے جس میں انہوں نے بندہ خدا کو خود کے لیئے سر گرداں دکھایا ہے جو زندگی کی دوڑ دھوپ میں اپنی ذات اور اس کے کمالات کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ قاصرؔ اس نظم کے زریعے بنی آدم کو یہ پیغام دیتے ہیں چلو واپس اس دیس جہاں سے تم وابستہ ہو کیوں اتنے خود شکستہ مارے مارے پھرتے ہو۔ایک نئی راہ کی تلاش میں نکلو۔

شاعری میں خواب ایک ہمہ جہت استعارہ ہے جو بیک وقت انسانی خواہشات ، لاشعور ، حقیقت سے مبرا اور روحانی بیداری کے بعد امکانات کو ظاہر کرتی ہے۔ قاصر کے ہاں خواب بیداری اور لاشعور کا سفر کا طے کرتے ہیں نظمیں "خواب سے بیداری تک"، " ہوئی ہیں بند آنکھیں اور خواب جاگے "ایسی دنیا کی نمائندگی کرتی ہے جہاں انسان بظاہر سکون میں ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ اپنی حقیقت سے دور۔ حقیقت کا ادراک اگرچہ بعض اوقات تکلیف دہ ہو سکتا ہے مگر یہی ادراک انسان کو اپنی اصلی پہچان تک لے جاتا ہے۔ قاصر کی اس خوبی پر "گلزار وفا چودھری "لکھتے ہیں:

"غلام محمد قاصرؔ سرابوں کے نہیں حقیقتوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ایسی حقیقتیں جو آج نہیں تو کل انسان کی گرفت میں ہوں گی "(17)

غلام محمد قاصرؔ لمحہ لمحہ سفر حیات طے کرتے ہوئے منزل کی جانب بڑھتے رہے۔ تجربات، مشاہدات، جذبات، ادھورے پورے معاملات کو سنبھال کر آگے بڑھتا ہوا یہ شاعر اپنی بات کہنے پر قادر تھا۔ آپ کی شاعری میں رجائیت کا ایک اہم عنصر معنوی پہلو داری ہے ۔ ادبی اصطلاح میں معنوی پہلو سے مراد کسی تخلیق کی باطنی فکری اور وجودی سطح ہے جہاں لفظ اپنے لغوی معنی سے آگے نکل کر ایک کلی تصور حیات پیش کرتا ہے۔ رجائیت کے تناظر میں معنوی پہلو" محض امید ہے" کہہ دینے سے نہیں بلکہ اس کے پیچھے کارفرما فلسفہ، نفسیات اور تہذیبی شعور کی دریافت ہے۔

استعارے کے استعمال کے بغیر شاعری میں لطف نہیں ہر شاعر کی طرح قاصر بھی خیالات کا اظہار استعارے سے کرتے ہیں اس حوالے سے "رانا خالد قیصر "لکھتے ہیں:

" قاصرؔ کے استعارے بہت وسیع معنویت کے حامل ہیں۔ یہ استعارات روایت کی پیروی میں نہیں بلکہ عصرِ رواں کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں"(18)

قاصرؔ کے استعارے روایت کے آئینے میں عصر رواں کے زخموں پر رکھا ہوا مرہم ہیں۔ وہ ماضی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ حال کے سوالات کو معنوی پیکر دیتے ہیں۔

تاریکیِ جاں نے صدیوں تک آئینہ دل کو دھندلایا
اے صبح جمال کی پہلی کرن پھر تیرا عکس نظر آیا(19)

میرؔ و غالبؔ کے ہاں "صبح جمال" ایک تہذیبی بیداری ہے جب کہ قاصرؔ کے ہاں "صبح جمال کی پہلی کرن" کا استعارہ صدیوں کی اجتماعی تاریکی کے جواب میں فرد کے باطن میں۔ موجود ازلی رجائیت کی بازیافت ہے۔

غلام محمد قاصر یاسؔیت کا انکار کیے بغیر زندگی کے اندر سے جواز تلاش کرتے ہیں۔ "فرار کی امید" نہیں "مقابلے کا حوالہ" ہے۔ قاصر کا عہد سیاسی جبر، سنسر شپ اور اجتماعی مایوسی کا عہد تھا ایسے میں باہر سے امید رکھنا خود فریبی ہی تھی۔ قاصر اپنی رجائیت کی بنیاد "خارج" پر نہیں "داخل" پر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر انسان کے اندر ایک ایسا چراغ روشن ہے جسے کوئی آمر، کوئی زوال، کوئی اندھیرا بجھا نہیں سکتا۔ اب یہ صوفیاء کے "نورِ باطن" کا جدید شعری اظہار ہے جب شاعر کہتا ہے کہ "دل کا دیا بام پر لے جاؤ" تو یہ دراصل قاری کو "اندرونی خود مختاری" کا سبق دے رہا ہے یعنی تمہارا اصل سہارا تمہارا یقین ہے۔ حکومت، زمانہ یا حالات نہیں۔

اندھیرے میں گیا روشنی میں لوٹ آئے گا
دیا جو دل میں جلتا ہے اسی کو بام پر لے جا(20)

یہاں اندھیرا صرف رات نہیں پورے عہد کی علامت ہے۔ "روشنی میں لوٹ آئے گا" اس یقین کا اظہار ہے کہ انسان اپنی اندرونی روشنی سے خارجی تاریکی کو شکست دے سکتا ہے۔ قاصر کی رجائیت کا یہ پہلو قاری کو مفعول سے فاعل بناتا ہے۔ اردو شاعری میں دکھ کا بیان نیا نہیں ہے مگر قاصر کا اسلوب نیا ہے۔ میرؔ و غالبؔ اور فیضؔ کے ہاں بھی غم ہے مگر قاصر غم کو "مسئلہ" سے "حل" میں بدلتے ہیں ان کے نزدیک دکھ صرف بیان تک رہے تو

وہ نوحہ گری میں ضائع ہو جاتا ہے اور اگر شخصیت کا حصہ بن جائے تو وہ ارتقاء ہے۔ یہ نفسیات میں sublimation کا اصول ہے جسے قاصرؔ نے شاعری میں برتا ہے۔

جزوِ شعر نہیں ہیں قاصرؔ جزوِ جاں کر ڈالے ؎
ہم کو جتنے درد ملے تھے میرؔ بنانے والے (21)

قاصرؔ شعری اوزان اور عروضی لوازمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پامال مضامین سے دور رہے ہیں۔ ان کے کلام میں روایت کے ساتھ ساتھ جدید رنگ نمایاں ہے ان کے اشعار میں تشبیہات ایک دلکش معنویت لیے ہوئے ہیں۔ قاصر شعر کہتے نہیں ہیں ان سے کوئی نادیدہ معرفت شعر کہلواتی ہے۔ تقلید کے بجائے آمد کا عنصر نمایاں ہے اور وہ بھی عہد رواں کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوا۔

ہر عہد کی نشو نما کے لیے وہ مہر و محبت کا موسم " ؎
یخ بستہ دنوں میں دھوپ بنے اور دھوپ کی شدت میں سایہ " (22)

قاصرؔ کی تشبیہ موسمی نہیں وجودی ہے۔ وہ کہتے ہیں محبت کوئی وقتی جذبہ نہیں بلکہ ہر عہد کی نشو نما کی شرط ہے۔ جامد نہیں ہے بلکہ حالات کے مطابق ڈھلنے والی قوت ہے۔ جب معاشرہ جمود، نفرت اور مایوسی کا شکار ہو تو محبت دھوپ بن کے اسے پگھلاتی ہے۔ جب معاشرہ نفرت کی شدت سے جل رہا ہو تو یہی محبت سایہ بن جاتی ہے۔

غلام محمد قاصرؔ کی جملہ شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ اس میں ان کا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ بقول "صوفی تبسمؔ"

"ان کے اشعار پڑھ کر ایک ہاتھ سے سر کو کھجانا اور دوسرے ہاتھ سے قلب کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ قاصرؔ کا اسلوب میر کی سادہ بیانی، غالب کی تخیل آفرینی اور اقبال کی وسیع النظری کے افق سے سر شار ہو کر ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، وہ استاد ہیں ان کی ابتدائی کوششوں میں بھی پختگی ہے۔"(23)

غلام محمد قاصرؔ رجائیت کے حوالے سے صفِ اول کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری رجائیت کے حوالے سے امید، اعتماد، مثبت سوچ، مستقبل پر یقین، عشق کی طاقت، صبر و استقامت، حسنِ ظن، زندگی سے محبت، روحانی سکون، ایمان، خوش بینی، خواب، آرزو، حسنِ فطرت کا بیان جیسے خصائص کی حامل ہے۔ قاصرؔ نے اپنی شاعری میں یاس اور قنوطیت کے بجائے پر امیدی کا مظاہرہ کیا اور فرد کو دنیا اور زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کا درس دیا۔ جمود کے بجائے تحرک اور عمل کی فضا نے ایسا منفرد رنگ پیدا کیا جو کلاسیکی شعراء سے مختلف ہے ان کی شاعری نہ صرف رجائیت کے حوالے سے بلکہ تمام شعری رموز کی ندرت، سادگی اور جاذبیت کی بدولت اردو شعری سفر میں اہمیت کی حامل ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ طیبہ النعم، رجائیت اور اس کے اردو شاعری پر متعلقہ اثرات کا تجزیہ، ایم فل سکالر زار دو غازی یونیورسٹی، ڈی جی خان، ص: 41

۲۔ الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز والغات، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ 1985، ص: 489

۳۔ عبد الحمید نظامی، لغاتِ نظامی، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، 1984ء

4: یوسف عزیز، شعاعِ اقبال بحوالہ، شگفتہ فردوس، مضمون، رجائیت ادب کا آفاقی رجحان، مشمولہ، بازیافت، شمارہ نمبر 26 (جنوری تا جون 2015ء) ۴۔ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور ص: 411

۵۔شاعر علی شاعرؔ مشمولہ رنگ ادب، غلام محمد قاصر نمبر، شمارہ 6, لاہور، رنگ ادب پبلیکیشنز، مئی 2022ء،ص:33

٦۔ماہنامہ آج کل ، نئی دلی،دسمبر2024ء،ڈاکٹر ناز بیگم،ص:47۔

۷۔شاعر علی شاعرؔ مشمولہ رنگ ادب، غلام محمد قاصر نمبر، شمارہ نمبر 6،لاہور، رنگ ادب پبلیکیشنز، مئی 2022,ص:307

۔غلام محمد قاصرؔ،اک شعر ابھی تک رہتا ہے، کراچی رنگ ادب پبلیکیشنز، مئی 2023ء، ص:228

۹۔ ایضاً،ص:247

۱۰۔ایضا,ص:169

۱۱۔ایضاً،ص:247

۱۲۔شاعر علی شاعرؔ مشمولہ، رنگ ادب، غلام محمد قاصرؔنمبر، شمارہ60، لاہور رنگ ادب پبلیکیشنز، مئی 2022ء،ص:129

۱۳۔غلام محمد قاصرؔ، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، کراچی، رنگ ادب پبلیکیشنز، مئی 2023ء ص: 170

ماہنامہ آج کل،نئی دلی،دسمبر2024ء،ڈاکٹر ناز بیگم،ص:47 ١٤-

۱۵۔غلامِ محمد قاصرؔ، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، کراچی، رنگ ادب پبلیکیشنز، مئی 2023ء، ص: 175

ایضاً،ص:354

۱۷۔شاعر علی شاعر، مشمولہ رنگ ادب، غلام محمد قاصر نمبر، شمارہ6، لاہور، رنگ ادب پبلیکیشنز، مئی 2022ءص:373

۱۸ایضاً،ص:325

۱۹۔ غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، کراچی، رنگ ادب پبلیکیشنز, مئی 2023ء ،ص:225

۲۰ایضاً،ص:189

۲۱۔ایضاً،ص:222

۲۲۔ایضاً،ص:287

۲۳۔ شاعر علی شاعر، مشمولہ رنگ ادب پبلیکیشنز،غلام محمد قاصر نمبر، شمارہ:6لاہور، رنگ ادب پبلیکیشنز، مئی2022ء،ص:23

فضہ خالد

ایم فل سکالر، جامعہ ہزارہ مانسہرہ

سکونت: کھواڑی، مانسہرہ، پاکستان

غلام محمد قاصر کی شعری لفظیات :"اک شعر ابھی تک رہتا ہے" کے تناظر میں

Abstract:

This article tends to examine the stylistic and linguistic features defining Ghulam Muhammad Qasir's poetic diction. He blended simplicity with depth and developed a unique style that diverged from the themes of traditional Urdu poetry. Despite being a native Saraiki speaker he appears as the master of Urdu poetry. His major works include "Tasalsal", "Aathwan Asman bhi Neela hay", "Darya e Guman", "Khushboo Grift e Aks mein" and " Tamannaon ke Saheefay se". His diction introduces us to a deliberate and disciplined linguistic engagement that proves him a major modern Urdu poet .

Key words: Ghulam Muhammad Qasir, diction, metaphor, word play, language, elements of life, movement.

کلیدی الفاظ:
غلام محمد قاصر، لفظیات، استعارہ، رعایت لفظی، زبان، زندگی کے عناصر، تحریک

اردو کے شعری منظر نامے پر غلام محمد قاصر ایک ایسے نابغۂ روزگار شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اس رہگزار پر کمالِ فن کے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اور وقتِ رخصت اپنا شہکار فنی سرمایہ ہمارے ہاتھوں میں تھما گئے ہیں جس پر طور کی کرنیں جلوہ افروز ہو کر تورات کی تابندگی عطا کرتی ہیں۔ قاصر ایسے شاعر ہیں:

ع جن کی درد بھری باتوں سے ایک زمانہ رام ہوا

(غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۲۶۰)

انہوں نے روایت اور جدت دونوں کا دامن تھامے رکھا لیکن اپنے فن کو کلی طور پر کسی ایک کے سپرد کرنے سے احتراز برتا اور اس کارزار میں اپنے لیے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ آپ نے اردو غزل کے کلاسیکی ڈھانچے میں جدت کی روح پھونکی، کلاسیکیت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید الفاظ و تراکیب، اچھوتے استعارات، اور علامات کا ندرت سے استعمال کر کے اسے ایک نیا اور دیدہ زیب پیراہن عطا کیا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ انہوں نے علامات کو ندرت سے برتا ہے نہ کہ نادر اور دور از کار علامات اور تشبیہات و استعارات کا سہارا لیا ہے۔ ان کی بیشتر علامات وہی اردو غزل کی روایت پر بکھری علامات ہیں لیکن قاصر کا فن اور فنی حکمتِ عملی انہیں جدید بناتی ہے۔

غلام محمد قاصر کی لفظیات اس قدر خوب صورت اور دلکش ہیں کہ پکار پکار کر "شہکار پر تبصرہ لکھنے" کا مطالبہ کرتی ہیں۔آج ان کی شاعری کی مختلف پرتیں ہٹاتے ہوئے احمد فراز کے الفاظ کانوں میں گونجتے ہیں اور ان کا کہا ایک ایک لفظ سچ ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ :

"غلام محمد قاصر عہدِ موجود کے مستند آہنگ اور معتبر آواز تھے۔ جدید کلاسیکل شاعری کو غلام محمد قاصر کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا

قاصر کا شعر مر سکتا ہے نہ وہ خود ہم سے جدا ہو سکتے ہیں۔ مستقبل کا نقاد ان کے فن پر کام کرے گا تو نئی جہتیں اور امکانات

سامنے آتے چلے جائیں گے۔"

(غلام محمد قاصر، اک شعر ابھی تک رہتا ہے، تقریظ، احمد فراز، رنگِ ادب پبلیکیشنز، کراچی، ۲۰۱۸، ص ۵۲۷)

انسان حیوانِ ناطق ہے اور اسی نطق اور قوتِ گویائی نے اسے دیگر مخلوقات سے ممیز و ممتاز کر کے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان کی ذات کے اندر ایک مکمل جہاں تخلیق کر چھوڑا ہے۔ اس کے دہن میں نطق کا ایک آلہ رکھ کر اسے گویائی کی قوتِ گویائی بخشی اور پھر آدم کو سارے نام سکھا کر یہ اعلان کیا:

"وَعَلَّمَ اٰدَمَ الاَسمَآءَ کلھا"

(القرآن، سورۃ البقرہ: آیت ۳۱)

اس کھنکتی مٹی کے پتلے کو حرف و صوت کی نعمت سے نواز کر خالق نے حیات میں سوز و ساز کے ایک حسین اور دلکش باب کا آغاز کیا ہے۔ بنی نوع انسان حروف کے تانے بانے سے الفاظ بن کر، انہیں آواز میں ملبوس کر کے زبان کے راستے دنیا کے سامنے پیش کرتے

ہیں۔اور پھر یہ الفاظ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر دنیا میں پھیل جاتے ہیں کبھی لہروں کی صورت رقص کرتے ہیں، کبھی درد کا درماں کرتے ہیں اور کبھی سامع کو زیرِ سناں کرتے ہیں۔

لفظیات کی ساری بحث الفاظ اور ان کی کارفرمائیوں کے گرد گھومتی ہے۔ دنیا بھر میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہماری زبان سے ادا ہونے والی ملفوظ آوازیں ہی زبان تشکیل دیتی ہیں۔ زبان کے ذریعے الفاظ کی صورت ہم اپنے احساسات وجذبات، محسوسات و خیالات اور سوالات و جوابات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ان ہی عناصر کو سلیقے اور قرینے سے تحریری صورت میں بیان کر دینے کا نام ادب ہے۔ ادب زبانوں کو زندہ رکھتا ہے اور زبانیں ادب کو جِلا بخشتی ہیں۔ لہذا ان دونوں کا ابتدائے آفرینش سے آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شعر و سخن کی اصل لفظ ہے اور ادب میں لفظوں کے سائنسی مطالعہ کا نام "لفظیات" ہے۔

لفظیات کے لیے انگریزی میں 'ڈکشن" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لفظیات اسلوبیات کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ شاعر یا ادیب نے اپنے فن پارے میں کس قبیل کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ان کو کس انداز میں برتا ہے اور اس کے الفاظ اور ان سے تشکیل پانے والا اسلوب اسے کس طرح دوسروں سے الگ اور منفرد شناخت عطا کرتا ہے ۔الفاظ کا انتخاب اور ان کا فنکارانہ استعمال شاعر اور ادیب کی پہچان بن جاتا ہے۔ اور ان کے ذریعے قاری مصنف کے ذہن کے نہاں خانوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اس کے شعور کے مختلف گوشوں سے روشناس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان لفظوں کے انتخاب کو معنی کا بنیادی عنصر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعر یا نثر نگار اظہارِ خیال کے لیے جو لفظ چنتا ہے وہی اس کی لفظیات قرار پاتے ہیں۔ اسلوب کے تنوع میں لفظیات کا بڑا حصہ ہے۔ شعر یا نثر کے آسان یا پیچیدہ، مفرس یا

معرب، سادہ یا رنگین، مانوس یا غریب ہونے کا انحصار ان لفظوں پر ہے جنہیں شاعر یا نثر نگار نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے پسند کیا ہو۔۔۔ لفظیات کے مطالعے سے شاعر یا نثر نگار کے شعوری اور غیر شعوری رجحانات پر روشنی پڑتی ہے، بعض لفظوں سے اس کی خاص رغبت، نفسیاتی کیفیات اور کشاکش کی غماز ہو سکتی ہے۔ "

(سہیل احمد خان، محمد سلیم الرحمٰن، مؤلف، منتخب ادبی اصطلاحات، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور، ۲۰۰۵، ص ۶۸)

شعری عمارت کو مضبوط پائیدار اور خوب صورت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر بطورِ معمار بہترین الفاظ کو بہترین تراش خراش کے ساتھ اس طرح استعمال کرے کہ وہ اثر پذیری اور حسن و دلکشی کا پیکر بن جائے۔ الفاظ کی حیثیت جسم کی ہے اور معانی روح کا درجہ رکھتے ہیں لہذا روح اور جسم دونوں کا صحت مند ہونا لازم و ملزوم ہے۔ شاعری ایک فنِ لطیف ہے اس لیے اس کے باطن کے ساتھ ساتھ اس کا حسنِ ظاہر، دلکشی اور جملہ جمالیاتی خوبیوں سے لبریز ہونا از حد ضروری ہے۔ تاکہ شعر آنکھوں میں سما جانے اور دل میں اتر جانے کی خاصیت رکھتا ہو۔ الطاف حسین حالی کو اردو شعریات کا اولین نقاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ تفحصِ الفاظ کے قائل ہیں۔ اس حوالے سے مقدمہ شعر و شاعری میں یوں رقم طراز ہیں:

"شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں، معانی کتنے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں، ہر گز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے، اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابلِ تحسین ہو سکتا ہے۔ "

(الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، شانتی پریس الہ آباد ۱۹۶۴)

شاعر کی الفاظ پر گرفت ضروری ہے اس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ الفاظ کو بطورِ آلہ کار استعمال کر کے اپنے فن کے ذریعے محاکات، مجرد عناصر کی تجسیم، تمثیل، ترصیع، تکرار

اور تلمیح جیسے حربے آزما کر الفاظ کو مفرد اور مرکب صورت میں اس عمدگی سے پیش کرتا ہے گویا کہکشاں سے ستارے چن چن کر شاعری نامی نازک اندام حسینہ کی مانگ میں سجا رہا ہو۔

غلام محمد قاصر کو الفاظ کے انتخاب اور استعمال پر قدرت حاصل تھی۔ شعر جو کہ قاصر کا مشغلہ تھا جب یہی مقصدِ حیات بنا تو آپ نے اس میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ آپ نے الفاظ کو اس عمدگی سے برتا کہ ان کے "سہمے سہمے لفظوں پر ہلکی سی کستوری" کا گماں گزرتا ہے۔ آپ کی شاعری میں الفاظ کی حرمت اور تقدس کا احساس ملتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاصر نظریں جھکائے اپنے ساتھ الفاظ کا ایک جہان لے کر شاعری کے معبد میں ادب سے ہاتھ باندھے داخل ہوتے ہیں اور پھر تمناؤں کے صحیفے کے مقدس اوراق پر شہکار فسانے رقم کرتے ہیں۔ قاصر کے کلام پر ایک پاکیزگی اور سکون کی فضا چھائی ہوئی ہے وہ غزل کہہ کر قلم توڑنے کے قائل نہیں بلکہ اسی قلم سے حمد، نعت، سلام اور مرثیہ جیسی مقدس اصناف میں بھی مشقِ سخن کرتے اور اسے سپردِ قرطاس کرتے ہیں۔

قاصر نے الفاظ کو کلیدی، تمثیلی، علاماتی، تشبیہاتی، استعاراتی، تلمیحاتی اور محاکاتی پیکروں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ آپ نے لفظی رعایت اور کفایت سے بھی کام لیا ہے اور صنائع لفظی کا متوازن اور متناسب استعمال بھی کیا ہے۔ آپ کی شاعری ان تمام زیورات سے لدی پھندی ہونے کے بجائے تناسب کی حامل ہے اور موقع محل کے مطابق صنائع کا حسبِ ضرورت استعمال ایک فرحت اور تازگی کا احساس بخشتا ہے۔

کلیدی اور علامتی الفاظ:

غلام محمد قاصر کی اِقلیمِ غزل کی بنیاد بھی وہی عناصر ہیں جو حیات و کائنات کے بنیادی عناصر ہیں یعنی "آگ، مٹی، ہوا اور پانی" قاصر کی شاعری کا علامتی نظام ان بنیادی

عناصر اور ان کے مظاہر سے لیس ہے۔ یہاں قاری جابجا آگ، مٹی، ہوا، پانی، دریا، سمندر، جھیل، کنواں، سیلاب، زلزلے، بھونچال، آندھی، طوفان، آتش فشاں، چنگاری، شعلے، حدت، تپش، تشنگی، تیرگی، ریت، سراب اور بادِ صرصر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ علامت استعارہ کی ترقی یافتہ شکل ہے جو تشبیہ و استعارہ کے تعلق کے ساتھ زیادہ بہتر انداز میں شاعر کا مافی الضمیر بیان کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً

؎ آتش و آب و باد و خاک تیری گلی میں ایک ہوں
تیرا جمال نظمِ جاں، تیرا جلال انقلاب

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۵)

؎ ہمارے گھر کی بنیادوں کے پتھر کیا ہوئے آخر
کہیں طوفان کے ٹکڑے کہیں سیلاب رکھے ہیں

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۴۸)

؎ سو پشت سے افلاس کا رخ میری طرف ہے
اس آگ نے اب تک خس و خاشاک نہ بدلے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۷۷)

گو کہ قاصر "عناصر سے دور" کے عنوان سے ایک نظم تخلیق کرتے ہیں لیکن در حقیقت انہیں عناصر کا گہرا شعور ہے۔ آپ ان سے اثر قبول کرتے ہیں انہیں اپنے اور دوسروں کے کچے گھروندے پر بارش اور سیلاب کے ممکنہ اثرات کا بخوبی اندازہ ہے۔ انہیں برف ہوتے جذبات اور آگ میں جھلستے اجسام کی تکلیف کا بھی احساس ہے جنہیں وہ علامت کے پردے میں احسن طریقے سے بیان کرتے ہیں۔

غلام محمد قاصر کے ہاں سفر زندگی کا استعارہ ہے۔ چلتے رہنے کا پیغام ہے۔ آپ اپنی شاعری میں جابجا سفر اور سفری لوازمات کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں سفر، کارروان، کشتی،

سمندر، کنارہ، جزیرہ، دشت، صحرا، پیاس، سراب، ساربان، رہگزر اور راستے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قاصر ہر گز زندگی سے مایوس نہیں ہیں بلکہ سفر کے ذریعے رجائیت کا پیغام دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہے شوقِ سفر ایسا ایک عمر سے یاروں نے
منزل بھی نہیں پائی، رستہ بھی نہیں بدلا

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ۵۰)

یہ جہاں نورد کی داستاں، یہ فسانہ ڈولتے سائے کا
مرے سر بریدہ خیال ہیں کہ دھواں ہے سونی سرائے کا

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۱۵)

زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائیں کسی سے
خوف و خواہش کے یہ پیکر نیند میں بھی چل رہے ہیں

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۴۲۶)

غلام محمد قاصر "تسلسل" کے شاعر ہیں۔ ان کی لفظیات اس بات کی مظہر ہیں کہ آپ کا کلام تحریک اور تسلسل کا پیغام ہے۔ آپ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ کلام میں مستعمل اجسام حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جن سے زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کا کلام گل ہائے رنگ رنگ سے مزین ہے جن میں موتیا، گلاب، کنول، نرگھس، صنوبر، لاج ونتی، رات کی رانی اپنے دیدہ زیب رنگوں، خوشبوؤں اور دیگر خصائص سمیت شامل ہیں۔ غلام محمد قاصر کے ہاں مختلف رنگوں کا تذکرہ بھی بارہا ملتا ہے۔ دنیائے علم و فن میں رنگ خوشی، غم، امید، مایوسی، پاکیزگی، امن، بہار، خزاں اور دیگر جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ غلام محمد قاصر نے اپنی شاعری میں زرد، سرخ، سبز، دھانی، سیاہ، مرمریں، نیلے و نیلگوں، آسمانی، زعفرانی، خاکی اور دھنک رنگوں کی خوب صورتی سے

آمیزش کی ہے۔ رنگوں اور پھولوں کے حسنِ امتزاج سے قاصر کی شاعری پر ایک بیش قیمت ٹیپسٹری کا گمان ہوتا ہے۔ ان تمام عناصر سے آپ کی فطرت اور مظاہرِ فطرت سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک جگہ آرزوؤں کے پھلنے پھولنے اور مٹ جانے کو باغِ حیات کے لیے بہار اور خزاں قرار دیتے ہوئے قاصر لکھتے ہیں:

زیست کی پھلواریوں میں جاں کے باغوں کے لیے
سبز چاہت آرزو، پیلی اداسی آرزو

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ۲۷۰)

آپ کی شعری اقلیم کا سفر کرتے ہوئے قاری کے حواسِ خمسہ ہمہ وقت بیدار رہتے ہیں۔ اس کے کانوں میں آہٹیں سرگوشیاں کرتی ہیں۔ آنکھیں جگنوؤں، تتلیوں اور خوب صورت پرندوں کا رقص ملاحظہ کرتی ہیں۔ حسِ شامہ کے ادراک سے جا بجا لطیف خوش بوؤں کے دبیز جھونکے اس کے نتھنوں تک آتے ہیں، وہ غزل کے عمدہ اشعار کے خوش ذائقہ ثمر سے سیر ہوتا ہے اور ٹٹول ٹٹول کر زیست کے عناصر کے نرم، ملائم، کھردرے، لطیف سطحی ٹیکسچر اور سرد و گرم کا مشاہدہ کرتا ہے۔

خوشبو گرفتِ عکس میں لایا اور اس کے بعد
میں دیکھتا رہا، تری تصویر تھک گئی

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۴۱۳)

غلام محمد قاصر کی شاعری میں واقعہ کربلا کو جس عقیدت، احترام اور فنکاری سے پیش کیا ہے اپنی مثال آپ ہے۔ واقعہ کربلا مزاحمت کا سب سے بڑا استعارہ ہے۔ قاصر کے ہاں اس کا بارہا استعمال نظر آتا ہے جو ہمیں ظلم کے خلاف ڈٹ جانے اور امام حسینؑ کے نقشِ

قدم پر چلتے ہوئے آخری سانس تک حق پر قائم رہ کر جان لٹانے اور سر خرو ہونے کا پیغام دیتا ہے۔

؎ کربلا عشق کا معیار بھی دشوار بھی ہے
آگے جنت ہے جو مل جاتی ہے آسانی سے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۵۰۳)

قاصر کی لفظیات سے وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کا احساس ملتا ہے۔ آپ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر مسلسل وقت کے دھارے کے ساتھ بہتے رہنے کی بات کرتے ہیں۔ سورج ان کے ہاں ظلم جبر اور استبداد کی طویل رات کے بعد ایک روشن صبح کا استعارہ ہے جبکہ چاند اس شبِ تاریک میں امید کی کرن ہے۔ آپ صبح، شام، دن، رات، بدلتے موسموں اور رتوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ آپ کی شعری بیاض پر تقویم کا گمان گزرتا ہے۔ چند ایک مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

؎ نازل ہوئے سو بار تمناؤں کے موسم
اور آب و ہوائے دلِ صد چاک نہ بدلے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۷۷)

؎ پر ولیتی ہے انگڑائی دھنک میں برف باری کو
یہ منظر نقش کرتے ہم اگر تم اس برس جاتے
ہوائیں کچھ بھٹکتی بدلیوں کے ساتھ ہیں ورنہ
محبت کی پھواروں کو مرے ساون ترس جاتے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۸۲)

موسم کی بدلتی رتوں، بہار، خزاں، تابستاں، زمستان، دھند، برف باری، برسات، پھوار، دھوپ اور جانے کتنے مناظر ان کے لفظوں کے ذریعے غزل کے کینوس پر منقش ہوئے ہیں۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قاصر زندگی میں کہیں بھی ٹھہراؤ اور جمود کے قائل نہیں ہیں۔ انہیں موسموں کی بدلتی ہوئی ادائیں پسند ہیں اور وہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں، نیز یہ کہ آگے بڑھنے کے سفر میں موسم کی بدلتی رتوں سے گھبرانے کے بجائے ان سے لطف اندوز ہونے کے متمنی ہیں اور اپنے قاری کو بھی یہی درس دیتے ہیں۔

تمثیلی الفاظ:

شاعری کے لیے اندازِ بیان اور تفحصِ الفاظ کے ساتھ ساتھ تخیل کی وسعت بھی انتہائی ضروری ہے۔ شاعر کا تخیل عام لوگوں کے، مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتا ہے جس کی آمیزش سے وہ اپنے کلام میں بو قلمونی کرتا ہے۔ تمثیل سے مراد ایسا اندازِ بیان ہے جس میں تشبیہات و استعارات کی مدد سے غیر ذی روح اشیا کو ذی روح اجسام کی صورت پیش کیا جاتا ہے۔ ذیل میں غلام محمد قاصر کے کلام سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

میں گن رہا تھا شعاعوں کے بے کفن لاشے
اتر رہی تھی شبِ غم شفق کے زینے سے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۶۵)

یہاں پہلے مصرع میں شاعر نے کس مہارت سے شام سمے شفق کی لالی سے زمیں پر پڑتی سورج کی سرخ شعاؤں کو بے کفن لاشوں کی صورت عطا کی ہے جبکہ دوسرا مصرع پڑھتے ہی ذہن میں شام کے بعد رفتہ رفتہ اترتی رات شفق کے زینے سے رفتہ رفتہ سیڑھیاں اترتی دوشیزہ ابھرتی ہے۔ قاصر کے کلام میں تمثیلی الفاظ کا عمدہ استعمال ملتا ہے۔

حسنِ تراکیب

غلام محمد قاصر نے کلام میں مفرد الفاظ کے ساتھ ساتھ خوب صورت اور کئی جدید تراکیب کا بھی عمدگی سے استعمال کیا ہے۔آپ کی تراکیب خالص اردو کے ساتھ ساتھ مفرس و معرب بھی ہیں جو اس مہارت سے استعمال کی گئی ہیں کہ ان پر بھی اردویت کا خیال گزرتا ہے۔ مثلاً سیرِ سماوات، موسمِ عصیاں، کاخِ کثافت، نقشۂ جور و جفا، گلِ ماہ، کفِ کوزہ گر، بساطِ گردشِ سال و سن، گلِ لرزاں، سفیرِ صبح، صدائے زخم، دورِ خزاں کار، دیوارِ بے سایہ، ماہ و سالِ وفا، اجرِ ملالِ عالمِ ہجراں، دھوپ کی پڑیا، شعاعوں کے بے کفن لاشے، درد کا دل، اشکوں کا مرثیہ، غزل کا لباس اور ان جیسی کئی اچھوتی تراکیب جو شاید ہی ان سے پہلے اردو ادب میں کسی نے برتی ہوں۔

؎ وہ بے دلی میں کبھی ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں
تو ہم بھی سیرِ سماوات چھوڑ دیتے ہیں

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۴۰)

؎ پل بھر کا یہ وصال نصیبوں کی بات ہے
اجرِ ملالِ عالمِ ہجراں ملا مجھے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۰۵)

؎ گلِ ماہ گھومتے چاک پر، کفِ کوزہ گر سے پھسل گئی
کہ بساطِ گردشِ سال و سن یہی فرق اپنے پرائے کا

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۳۱۵)

لفظیات کا علم قاری کو مصنف کے شعور اور لاشعور کے مختلف گوشوں تک پہنچاتا ہے۔ قاصر کی لفظیات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ آپ فطرت اور مظاہرِ فطرت سے خاص

دلچسپی رکھتے تھے اور ان سے اثر قبول کرتے تھے۔آپ بدلتے موسموں کے ساتھ رنگوں اور قوسِ قزح کا ذکر بھی کرتے ہیں غمِ دوراں کی برف باری، ساون، بارش اور برسات کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے تو اس کی کرنیں قاؔصر کے کلام پر پڑتی ہیں اور پھر قوسِ قزح چہار سو اپنے رنگ بکھیر دیتی ہیں۔ جو اس بات کی مظہر ہے کہ شاعر ایک حساس دل کا مالک ہے اور گرد و پیش کے حالات سے اثر قبول کرتا ہے۔ نیز اس کا ذہن کسی ایک نقطے میں قید ہونے کے بجائے سیرِ سماوات کا قائل ہے۔ تراکیب میں عربی و فارسی الفاظ کا حسنِ امتزاج قاؔصر کے فنی کمال اور لفظی بازی گری کا بیّن ثبوت ہے۔

صنائع لفظی:

صنائع صنعت کی جمع ہے۔ مصنف اپنے کلام کو جدت، ندرت، حسن اور دلکشی عطا کرنے کے لیے ادائے مطلب کے نت نئے انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ لفظی و معنوی شعبدہ بازیاں دکھاتا ہے۔ جس سے کلام میں ظاہری اور معنوی دونوں طرح کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ لفظیات کے ضمن میں کسی ادب پارے میں مستعمل صنائع لفظی کو پرکھا جاتا ہے۔ صنائع معنوی و لفظی کے استعمال کے متعلق افضل صفی لکھتے ہیں:

"شعر کی تزئین و آرائش کے لیے صنائع بدائع کا استعمال بھی اہمیت کا حامل ہے۔ صنائع لفظی و معنوی وہ کاری گریاں ہیں جن کی بنا پر شعر کو خوب صورت بنایا جاتا ہے۔۔۔ صنائع بدائع کا استعمال شاعر کے ذہنی رجحانات کا عکاس ہوا کرتا ہے یہ استعمال ایسے ہنر مندانہ اور فنکارانہ انداز سے ہونا چاہیے کہ کہیں بھی شعوری کوشش کا احساس نہ ہو۔ فنکار کے تخلیقی عمل میں صنائع اس اس قدر رچ بس جائیں کہ بات بر محل ہونے کے ساتھ ساتھ فطری محسوس ہونے لگے۔"

(افضل صفی، احمد فراز کی شاعری کا فنی اور اسلوبیاتی مطالعہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۳، ص ۲۷۔۲۸)

صنائع بدائع کو شاعری کا زیور کہا جاتا ہے۔ان کے استعمال سے کلام کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے لیکن یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ یہ زیور شاعری کے اصل حسن کو گہنا کر نہ رکھ دیں اور نہ ہی اس کے چہرے پر اضافی معلوم ہوں بلکہ توازن اور تناسب کا خیال رکھنا ضروری ہے تاکہ وحدت کا تاثر قائم ہو۔غلام محمد قاؔصر کی لفظیات کا عمیق مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کی قاؔصر نے اپنے طبعی توازن اور اعتدال کا دامن یہاں بھی مضبوطی سے تھامے رکھا۔صنعتوں کے استعمال میں اس تناسب سے کام لیا گیا ہے کہ ادائے مطلب میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوتی اور صنعت گری کی زیادتی سے شاعری کا حسن بھی ماند نہیں پڑتا۔

صنعتِ تضاد:

کلام میں دو یا زائد ایسے الفاظ کا اکٹھا کرنا جو معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں۔اس صنعت کو صنعتِ طباق یا تکافو بھی کہا جاتا ہے۔عالم میں اشیا کا وجود ان کے نہ ہونے کی ضد ہے اسی طرح تمام اشیاء اپنے اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔" و خلقنٰکم ازواجا" کے تحت تمام چیزیں جوڑوں کی شکل میں پیدا کی گئی ہیں۔روشنی اندھیرا، آگ، پانی، ہجر وصال، سرد گرم، دن رات، نشیب و فراز، پستی بلندی سب ایک دوسرے کے الٹ ہیں۔ان کا آپس میں معکوس تعلق ہے ایک کا ہونا نہ ہونا دوسرے کے ہونے نہ ہونے کی شرط ہے۔غلام محمد قاؔصر کے کلام میں اس صنعت سے بڑی عمدگی سے کام لیا گیا ہے۔"اک شعر ابھی تک رہتا ہے" سے چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

؎ میزانِ عاشقی میں برابر ہیں عرش و فرش
نقشِ قدم تمہارے، یہاں بھی، وہاں بھی ہیں

(،اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۱۳۰)

؎ وہ بلندیاں ہوں کہ پستیاں سبھی فیصلے ہیں نگاہ کے
کہیں خود زمیں پہ جھک گئی کہیں آسماں کو جھکا دیا

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۱۲۰)

صنعتِ تلمیح:

تلمیح صنائع لفظی کی بہت خوب صورت اور نسبتاً زیادہ مستعمل صنعت تصور کی جاتی ہے۔ جب شاعر کلام میں ایسے تشریح طلب الفاظ لاتا ہے جو قاری کے ذہن کو کسی تاریخی واقعے کی جانب منتقل کر دیتے ہیں اسے صنعتِ تلمیح کہا جاتا ہے۔ لمح البصر میں قاری گزرے زمانوں میں پیش آنے والے واقعے کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ تلمیح کے ذریعے شاعر کے غالب ذہنی رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔

؎ اب تو ماضی کے کھنڈر اور بھی ویراں ہیں کہ ہم
حادثے جو بھی تھے مشہور اٹھا لائے ہیں

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۱۰۴)

غلام محمد قاصر کا مندرجہ بالا شعر اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے تاریخ کے اوراق سے مشہور واقعات کو اٹھا کر اپنی غزل میں سمو دیے ہیں۔ قاصر کے ہاں قرآنی تلمیحات، عرب و ایران اور ہندوستان کے مشہور واقعات، اور سب سے بڑھ کر واقعہ کربلا کو عمدگی سے برتا گیا ہے۔ جس سے قاصر کی عقیدت مندی کا احساس ابھرتا ہے۔

؎ دل کی رائے میں ہے آئینِ محبت برحق
درد قابیل کا منشور اٹھالائے ہیں

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۱۰۳)

؎ نہ وسوسے نہ اندھیرے رگوں میں پلتے ہیں
کہ میرے دل میں بہتر چراغ جلتے ہیں

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۲۹۵)

؎ کیسے کروں عبور وفا کے چناب کو
یہ تم بھی جانتے ہو کہ کچا گھڑا ہے دل

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۸۹)

قاصر کے کلام میں جا بجا انبیاء کرامؑ، اہلِ بیتؑ، لوک داستانوی عناصر لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں، سوہنی مہیوال، عظیم فاتحین، ان کی تعمیرات، آسمانی کتب، اور آیاتِ قرآنی وغیرہ کو بطور تلمیح استعمال کیا گیا ہے۔

صنعت رعایتِ لفظی

رعایتِ لفظی سے مراد اظہار کا ایسا نیا اور اچھوتا انداز ہے۔ جہاں شاعر لفظی الٹ پھیر کے ذریعے لفظی کرتب دکھاتے ہوئے مختلف پینترے بدلتا ہے اور اپنے مطلب کو بیان کرنے کے لیے نیا رنگ و آہنگ اختیار کرتا ہے۔ قاصؔر نے روایت اور جدت کے بیچ کا راستہ اختیار کیا۔ اور روایتی مضامین کو بیان کرنے کے لیے نئے نئے پیرایہ اظہار اختراع کیا، ذیل میں کچھ مثالیں دی جاتی ہیں:

؎ اے عشق نامراد تری عمر ہو دراز
تو مٹ گیا تو حسن کے گھر جائے گی یہ رات

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص۸۸)

؎ جاگ اٹھے بت تو پرستش سے بھی راضی نہ ہوئے
شکمِ سنگ میں سوئے تھے کس آرام کے ساتھ

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص۸۳)

؎ منجمد سجدوں کی یخ بستہ مناجاتوں کی خیر
آگ کے نزدیک لے آئی ہے پیشانی مجھے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص،۴۸۱)

؎ بے ردا، دامن دریدہ، پابجولاں، سرنگوں
آج کس کو زندگی کے دیکھنے کی تاب ہے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص۷۵)

لفظی رعایتیں برتنا قاصر کا خاصہ ہے۔ ایسا کون سا مضمون ہے جو شعری دنیا میں متقدمین کی نظروں سے اوجھل رہا ہو لیکن انہی روایتی مضامین کو جس جدت سے آپ نے نیا رنگ وآہنگ دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

صنعت مراعاۃ النظیر:

کلام میں ایک لفظ یا شے کی مناسبت سے اس کے دیگر متعلقات کا ذکر کرنا صنعت مراعاۃ النظیر کہلاتی ہے۔ اس صنعت میں شاعر لفظی مناسبات کا تعین کرتا ہے۔ غلام محمد قاصر تسلسل کے شاعر ہیں اور یہ تسلسل ان کے ہاں اس صنعت کے استعمال میں بھی نظر آتا ہے کہ یکایک اک لفظ کی مناسبت سے الفاظ کا انبار لگا کر پورا منظر تخلیق کر دیتے ہیں جس میں کوئی کجی دکھائی نہیں دیتی۔

؎ کہیں دریدہ، کہیں ہیں دھبے اور کہیں ہاتھوں کے نشاں
ہستی کا پیراہن ہے یا طفلِ ابجد خواں کی کتاب

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۱۰۷)

وصل کے لفظ، فراق کی سطریں، یاد کے صفحے، غم کے ورق
کتنی پھیل گئی ہے قاصر عشق کے اک عنواں کی کتاب

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۱۰۷)

؎ صحنِ چمن ہے ایک عدالت، پتے ضامن، خار وکیل
منصف گلچیں، شاہد خوشبو، مجرم پھول، کٹہرا رنگ

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، تسلسل، ص ۱۰۵)

یہاں شاعر اس فن کاری سے اشعار میں الفاظ جوڑتا ہے جیسے معمہ حل کر رہا ہو اور پھر ایسا منظر تکمیل پا کر سامنے آتا ہے کہ ہر ٹکڑا اپنی جگہ مکمل نظر آتا ہے اور کوئی خلا باقی نہیں رہنے دیتا۔

صنعت اشتقاق:

ایک ہی مادہ یا مصدر سے نکلنے والے الفاظ کا کلام میں استعمال صنعتِ اشتقاق کہلاتا ہے۔ اس کے لیے شاعر کا لسانی شعور اور لغت پر عبور ضروری ہے۔ قاصر کے ہاں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

؎ شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھس گئے آخر کنکر جو نوکیلے تھے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۴۱)

قاصر مرے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں
مقتول کی قبا پر قاتل کے دستخط بھی

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۶۲)

؎ ایک غزال کو دور سے دیکھا اور غزل تیار ہوئی
سہمے سہمے لفظوں میں ہلکی سی کستوری تھی

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص، ۳۰۵)

لفظیات کی بنیاد لفظ ہے اور شاعر کا الفاظ کے وسیع ذخیرے میں سے بہترین الفاظ کا بہترین استعمال اس کی الفاظ پر قدرت کی دلیل ہے۔ ایک مصدر سے مشتق الفاظ لفظی معنوی اور صوتی سطح پر شعر کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

اشتقاق شبہ:

بعض اوقات شاعر اپنے کلام میں اس نوع کے الفاظ لاتا ہے جن پر پہلی نظر میں ایک ہی مصدر سے مشتق ہونے کا گماں ہوتا ہے لیکن غور کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ بظاہر ایک جیسے نظر آنے والے الفاظ دراصل ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ مثلا

؎ ایک آنچل کی آنچ سے قاصر
ہم جلے اور تا حیات جلے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۲۲۶)

شاعر لفظوں کے ذریعے قارئین کو مسحور کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایسے الفاظ اکٹھے لاتا ہے جن کو دیکھ کر پہلے پہل ایک ہی ماخذ سے نکلنے کا خیال آتا ہے لیکن

دراصل شاعر اپنے کرتب سے قاری کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہے۔ قاصر کے کلام میں بھی کئی مقامات پر اشتقاق کا شائبہ گزرتا ہے۔

صنعتِ تکرار:

کلام میں الفاظ کو مقرر لانا تاکہ حسن و خوبی اور بات میں وزن پیدا ہو۔ اسے صنعتِ تکریر بھی کہتے ہیں۔ غلام محمد قاصر کے کلام سے تکرار کی چیدہ چیدہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

؎ طے ہو سکے نہ دشتِ جدائی کے فاصلے
ہر چند اشک اشک بیاباں نورد تھا

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۸۶)

؎ ہوا خواب خواب سے بدگماں مرے رتجگے میں نہیں ہے وہ
وہ جو عکسِ ہجر و وصال تھا کسی آئینے میں نہیں ہے وہ

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۲۸۲)

؎ سبزہ زاروں، پانیوں، سایوں سے سرمایوں سے دور
کربلا کا راستہ ہے کربلا تا کربلا

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۵۰۴)

تکرار سے جہاں کلام میں صوتی حسن پیدا ہوتا ہے ساتھ ہی ساتھ تکرار لفظی و حرفی سے جذبات کی شدت کا احساس بھی ابھرتا ہے۔ غلام محمد قاصر کی کلیات کا پہلا شعر ہی اس خوب صورت صنعت کا حامل ہے اور پھر بعد ازاں آپ کے پورے کلام میں کچھ خاص الفاظ

اور علامات کو ایک خاص قرینے سے مکرر لایا گیا ہے جو آپ کی شعری فکر کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

ذو معنویت:

ابہام یا ذو معنویت کو شاعری کا حسن کہا جاتا ہے۔ شاعر نثر نگار کی طرح بآسانی اپنا مطمع نظر قاری کے ہاتھ میں نہیں تھما دیتا بلکہ وہ اصل مطلب تک پہنچانے کے لیے کئی پرتیں ہٹانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ بعض اوقات اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے ایک سے زیادہ معنی نکلتے ہیں۔ غلام محمد قاصر کے کلام سے ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

؎ کیا قہر ہے کہ وہ لبِ شیریں مرے لیے
دو لفظ کہہ کے تیشۂ فرہاد ہو گئے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۱۶۲)

؎ مشہور ہے وہ شہر سڑک تک تو آیئے
سمتِ سفر بتانے کو پتھر بھی آئیں گے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۸۵)

پہلی مثال میں لبِ شیریں کی ترکیب کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو فرہاد کی محبوبہ شیریں کے ہونٹ جبکہ دوسرے شاعر کے لیے میٹھے بول بولنے والی ہستی کے لب جنہوں نے دو لفظ بولنے کے بعد تیشہ فرہاد کی روش اختیار کر لی ہے۔ جبکہ دوسری مثال میں سمتِ سفر بتانے کے لیے آنے والے پتھروں کے متعلق ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان پتھروں سے مراد راستے کے پتھر ہیں، اس شہر کے پتھر دل لوگ ہیں یا پھر وہ جس شخص کو گھر آنے کی دعوت دے رہے ہیں اس سے یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کے شہر میں سفر کی سمت بتانے کے

لیے سنگِ میل نصب ہیں جو ان کے گھر تک پہنچا دیں گے۔ اس طرح کی کئی عمدہ مثالیں قاصر کے کلام میں موجود ہیں۔

صنعتِ تجنیس:

لفظ تجنیس جنس سے ہے۔ کلام میں دو یا زیادہ متجانس الفاظ کا ایک ساتھ برتنا صنعتِ تجنیس ہے۔ ایسے الفاظ جو ایک جنس سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان میں حروف کی ترتیب و تعداد اور تلفظ و املا میں یکسانیت ہو لیکن معنوی لحاظ سے اختلاف ہو۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ قاصر کے کلام میں صنعتِ تجنیس کے عمدہ نمونے ملتے ہیں:

؎ باقی ہیں راہِ عشق میں بے شمار موڑ
سانول مہار موڑ کہ اب تھک گیا ہے دل

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، تسلسل، ص۸۹)

یہاں ایک موڑ اسم ہے جو خم یا پیچ کے معنی دے رہا ہے جبکہ دوسرا موڑ فعل ہے جس کے معنی رخ بدلنے یا پلٹ جانے کے ہیں۔ اس لیے یہ شعر تجنیسِ مستوفی کی مثال ہے۔

؎ اک شخص کا عکس چار سو ہے
اک گل کو گلاب لکھ رہا ہوں

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص۱۳۹)

کلام میں دو ایسے متجانس الفاظ کا استعمال کرنا جن میں ایک کے آخر میں دو حروف اضافی ہوں تجنیسِ مذیل کہلاتی ہے۔ اس شعر میں گل اور گلاب اس کی مثال ہیں۔

ڈر کر شجر سے اڑ گئی پتوں کی ایک ڈار
تو قتل کر رہا تھا مرے روبرو مجھے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے،، ص ۶۷)

ظلم و ظلمت کے زمانوں پہ زوال آیا تھا
جب تری عمر کا چالیسواں سال آیا تھا

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے،، ص ۲۹۰)

مندرجہ بالا اشعار صنعتِ تجنیسِ زائد و ناقص کی مثال ہیں جہاں دو متجانس الفاظ میں سے ایک میں ایک حرف کا اضافہ ہوا ہے۔

لگتا ہے جل رہے ہیں ہم، نیند میں چل رہے ہیں ہم
سہتے ہیں گھر میں بیٹھ کر دربدری کا ہر عذاب

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص، ۳۵۱)

ذہن میں نور ہو گیا، آنکھ میں اشک ہو گیا
آج خیالِ یار بھی قید ہے ذات پات میں

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۷۹)

ان اشعار میں ایسے متجانس الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن میں صرف ایک قریب المخرج حرف کے اختلاف سے دونوں کے مابین فرق پایا جائے۔ اسے تجنیسِ مضارع کا نام دیا جاتا ہے۔

دل کا اک زخم بھی کیا رنگ دکھاتا ہے مجھے
پھول دیکھوں تو مدینہ نظر آتا ہے مجھے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۲۹۱)

؎ بچاؤ خالی ہاتھ سے کیا تو زخم سہہ گئے
ہر ایک تیر کے لیے کمان بن کے رہ گئے

ایسے الفاظ جن کے ہجے اگر الٹ دیے جائیں تو عین وہی لفظ بنے جب کلام میں ایک ساتھ استعمال ہوں تو اس صنعت گری کو تجنیسِ قلب کا نام دیا جاتا ہے۔ ان اشعار میں لفظ کا کو الٹا کرنے سے اک بنتا ہے، اسی طرح کیا کو الٹ دیں تو ایک اور ہر کو الٹنے سے لفظ رہ بنتا ہے۔ قاصر کے کلام میں جملہ فنی نزاکتوں کو اس باریکی سے استعمال کیا گیا ہے۔ جو غور کرنے پر بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

کفایتِ لفظی:

کفایتِ لفظی کے معنی ہیں کم سے کم الفاظ میں بڑے سے بڑے معنی و مطالب کو بیان کر دیان کہ اظہار کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ نے پائے۔ کفایت، لفظی اور سہلِ ممتنع گو الگ الگ ہیں لیکن غلام محمد قاصر کے ہاں کفایتِ لفظی کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن پر سہلِ ممتنع کا گمان بھی ہوتا ہے۔

؎ دل سے روٹھتی دھڑکن کو
پھر اک بار منا جانا
اتنا ضروری کام نہیں
فرصت ہو تو آجانا (اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۲۷۳)

؎ کیا کروں میں یقیں نہیں آتا
تم تو سچے ہو بات جھوٹی ہے

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۱۵۸)

آپ کا کلام کفایتِ لفظی کی عمدہ مثالیں اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ پوری پوری نظمیں اور غزلیں اس صنعت کی مثالیں ہیں۔ مندرجہ بالا صنعتوں کے علاوہ غلام محمد قاصر کے کلام میں صنعتِ جمع، لف و نشر، ترافق، حسنِ تعلیل، تضمین اور حسنِ تعلیل کی بھی خوب صورت مثالیں ملتی ہیں۔

غلام محمد قاصر کی لفظیات اور دیگر جملہ محاسنِ کلام کی عمدگی اس بات کی متقاضی ہے کہ آرزو کی انگلیوں سے دھڑکنیں تحریر کر کے ان کے شہکار پر تبصرہ لکھا جائے۔

؎ آرزو کی انگلیوں سے دھڑکنیں تحریر کر کے
اس نظر سے کہہ مرے شہکار پر اک تبصرہ لکھ

(اک شعر ابھی تک رہتا ہے، ص ۴۷)

اس شہکار تبصرہ لکھتے ہوئے بطور مثال پیش کیا جائے کم معلوم ہوتا ہے اور ہر صفحے پر نظر دوڑاتے ہوئے یہی خیال آتا ہے کہ

ع "اک شعر ابھی تک رہتا ہے"

مجموعی طور پر غلام محمد قاصر کی لفظیات کا جائزہ لینے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آپ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ آپ الفاظ کا نہایت سلیقے سے انتخاب اور قرینے سے استعمال کرتے تھے۔ ان کی شعری لفظیات میں ایک خاص قسم کا توازن ملتا ہے۔ آپ کے ہاں دستک کا ذکر بار بار ملتا ہے تو اسی مناسبت سے در اور دریچے کی بات بھی کرتے ہیں۔ اور یہ دستک آپ کے کلام میں جہانِ معنی اور فکر و فلسفہ کے در وا ہونے کا تاثر دیتی ہے۔ آپ تحریک اور حرکت و عمل کا پیغام دینے کے لیے سفر، کارِ رواں، کشتی، سمندر اور اس جیسے کئی متحرک الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی غزل کی فضا پر پاکیزگی کی اجلی سفید چادر تطہیر تنی ہے جہاں

ابتذال کا دور دور تک شائبہ نہیں ہوتا۔ قاصر " تسلسل " کے ساتھ " دریائے گماں " کی لطافتوں پر وقت کے دھارے کے ساتھ بہنے کی جستجو میں سیرِ سماوات کرتے ہیں اور اپنی شعری لفظیات کے ذریعے ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ "آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے" اور پھر "خوشبو گرفتِ عکس میں " لے کر اپنے تجربات ومشاہدات کو تمناؤں کے صحیفے پر رقم کرتے ہیں۔۔اور اس تمام کار گزاری میں الفاظ کو بطور آلہ کار استعمال کرتے ہیں۔اس سے آپ کے لسانی اور لسانیاتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

Editorial Board

Prof. Qazi Ubaidur Rahman Hashmi
Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

Prof. Dr. Khalid Mahmood
Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

Prof. Nadeem Ahmad
Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

Prof. Mohammad Kazim
Department of Urdu, University of Delhi, Delhi

Prof. Dr. Ahmad Imtiaz
Department of Urdu, University of Delhi, Delhi

Prof. Dr. Mohammad Mohsin
Department of Urdu, Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi

Prof. Dr. Rasal Singh
Department of Hindi, Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi

Prof. Kausar Mazhari
Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

Prof. Imran Andleeb
Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

Prof. Dr. Mushtaq Alam Qadri
Department of Urdu, University of Delhi, Delhi

Dr. Sanjay Kumar
Centre for Deen Dayal Upadhyaya Studies Central University of Himachal Pradesh

Prof. Balram Shukla
Department of Sanskrit, University of Delhi, Delhi

Prof. Dr. Shahid Razmi
Department of Urdu, Munger University, Bihar

Prof. Pramod Kumar Bharti
Department of Sanskrit, Municipal PG College, Mussoorie, Uttarakhand

Master Mohammad Rafi
State Convener, Rashtriya Shikshak Sangathan, Bihar

Maulana Mohammad Shahid Adil Qasmi
Principal, Madrasa Yateem Khana, Araria

Dr. Mujeeb Ahmad Khan
Department of Urdu, Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi

Dr. Nadeem Ahmad
Department of Urdu, Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi

Dr. Roopesh Kumar Chauhan
Assistant Professor Department of Sanskrit, Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi

Dr. Arif Ishtiyaq
Department of Urdu, Satyawati College, University of Delhi, Delhi

Dr. Pushpendra Kumar Nim
Department of Urdu, Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi

Sima Zeb
PhD Research Scholar, Department of Urdu Hazara University, Mansehra, Pakistan

ISSN 2582-1229,E-ISSN 2582-9157

Quarterly

Delhi

TAREEKH-E-ADAB-E-URDU

UGC CARE LISTED, PEER REVIEWED, REFEREED, INTERDISCIPLINARY AND MULTILINGUAL RESEARCH JOURNAL

Volume: 8 *July to September 2026* *Issue: 3*

Patron-in-Chief:	**Prof. Irteza Karim**	Patron-in-Chief:	**Prof. Rakesh Kumar Pandey**
Editor	**Prof. Dr. Md. Yahya Saba**	Sub-Editor	**Md. Rameez Raza Misbahi**
Technical & Designer	**Md Shahid Raza Misbahi**	Associate Editor	**Dr. Md. Bahlul**

Legal Advisors	**Adv. Anil Kumar Singh**	*Legal Advisors*	**Adv. Seema Singh**

Subscription Rates

Per Issue:1000 *Annual:15000*

Special Issue:3000 *Special Support:25000*

Bank Details

PEACE INDIA FOUNDATION

Account No. — 51521131001918 *IFSC Code — PUNB515210*

Published and printed by

Prof. Dr. Md Yahya Saba ,At JK Offset Printing Press and distributed from:
2496, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-110007
E-mail: editortau@gmail.com *website*: tareekheadabeurdu.com
Mobile No:+91-9968244001,6394368447

ISSN 2582-1229,E-ISSN 2582-9157

سابق یو جی سی کیئر لسٹڈ بین الاقوامی پیر ریویوڈ ریفریڈ جرنل

سہ ماہی — دہلی



غلام محمد قاصر

UGC Care Listed
International Peer Raviewed Refreed Journal